درجہ - 9

درخشاں

INDIAN ARMY

Arms you FOR LIFE AND CAREER AS AN OFFICER
Visit us at www.joinindianarmy.nic.in
or call us (011) 26173215, 26175473, 26172861

Course	Vacancies Per Course	Age	Qualification	Appln to be received by	Training Academy	Duration of Training
NDA	300	16½ - 19 Yrs	10+2 for Army 10+2 (PCM) for AF, Navy	10 Nov & 10 Apr (by UPSC)	NDA Pune	3 Yrs + 1 yr at IMA
10+2 (TES) Tech Entry Scheme	85	16½ - 19½ Yrs	10+2 (PCM) (aggregate 70% and above)	30 Jun & 31 Oct	IMA Dehradun	5 Yrs
IMA(DE)	250	19 - 24 Yrs	Graduation	May & Oct (by UPSC)	IMA Dehradun	1½ Yrs
SSC (NT) (Men)	175	19 - 25 Yrs	Graduation	May & Oct (by UPSC)	OTA Chennai	49 Weeks
SSC (NT) (Women) (Including Non- tech Specialists and JAG entry)	As notified	19 - 25 Yrs for Graduates 21-27 Yrs for Post Graduate/ Specialists/ JAG	Graduation/ Post Graduation /Degree with Diploma/ BA LLB	Feb/Mar & Jul/ Aug (by UPSC)	OTA Chennai	49 Weeks
NCC (SPL) (Men)	50	19 - 25 Yrs	Graduate 50% marks & NCC 'C' Certificate (min B Grade)	Oct/ Nov & Apr/ May	OTA Chennai	49 Weeks
NCC (SPL) (Women)	As notified					
JAG (Men)	As notified	21 - 27 Yrs	Graduate with LLB/ LLM with 55% marks	Apr / May	OTA Chennai	49 Weeks
UES	60	19-25 Yrs (FY)18-24 Yrs (PFY)	BE/B Tech	31 Jul	IMA Dehradun	One Year
TGC (Engineers)	As notified	20-27 Yrs	BE/ B Tech	Apr/ May & Oct/ Nov	IMA Dehradun	One Year
TGC (AEC)	As notified	23-27 Yrs	MA/ M Sc. in 1st or 2nd Div	Apr/ May & Oct/ Nov	IMA Dehradun	One Year
SSC (T) (Men)	50	20-27 Yrs	Engg Degree	Apr/ May & Oct/ Nov	OTA Chennai	49 Weeks
SSC (T) (Women)	As notified	20-27 Yrs	Engg Degree	Feb/ Mar & Jul/ Aug	OTA Chennai	49 Weeks

درخشاں

اردو کی درسی کتاب نویں جماعت کے لیے

Urdu Textbook for Class IX

بہار اسٹیٹ ٹیکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ، پٹنہ

ڈائرکٹر (سکنڈری ایجوکیشن)، محکمۂ تعلیم، حکومت بہار سے منظور

☆صوبائی کونسل برائے تعلیمی تحقیق وتربیت (SCERT) بہار، پٹنہ کے تعاون سے پورے صوبۂ بہار کے لئے

©بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن، لمیٹڈ، پٹنہ

پہلی اشاعت	:	2009	50,000
دوسری اشاعت	:	2009	50,000
تیسری اشاعت	:	2011	75,000
چوتھی اشاعت	:	2014-15	20,000
پانچویں اشاعت	:	2015-16	15,000

قیمت: Rs. 35/-

:- شائع کردہ :-

بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن، لمیٹڈ

پاٹھیہ پستک بھون، بدھ مارگ، پٹنہ۔ 800001

مطبوعہ: نیشنل پرنٹنگ ورکس، گن گن سنگھ لین، پٹنہ۔٦

اپنی بات

گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی نئے نصاب تعلیم کے مدِ نظر نویں جماعت کے لیے زبان و ادب کی نئی کتاب اپنے صوبے کے ہونہار طالب علموں کے لیے پیش کرتے ہوئے ہمیں بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ اس سے قبل ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، بہار نے تمام زبانوں کی کتابیں بہار ہی میں تیار کر کے پیش کرنے کا جو نشانہ رکھا تھا، اس میں پچھلے سال گیارھویں اور بارھویں جماعت کی کتابیں شائع ہوئیں اور اب نویں جماعت کی درسی کتاب آپ کے پیش نظر ہے۔ یہ کتابیں تعلیم کے جدید تصورات کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی ہیں۔ اس لیے ان کتابوں سے ہمارے طالب علم زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کر سکیں گے۔

جب تک ہمارا نصابِ تعلیم معیاری نہ ہوگا اور اس کے مطابق مناسب درسی کتابیں تیار نہ کر دی جائیں، اس وقت تک ہم اپنے ہونہار طالب علموں کی ضرورتوں کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ کتاب ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ تیار کی گئی ہے جس میں ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ اسباق کے سمجھنے میں طلبہ کو زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل ہو؛ اساتذہ کو تدریس کے دوران درسی کتاب کے ذریعے بھرپور تعاون مل سکے اور ہمارا طالب علم چلتے پھرتے زندگی کی بڑی بڑی باتیں اور علم و ادب کے گہرے رموز سیکھتا جائے۔ اس کے لیے اسباق کے متن پر بھرپور تجزیاتی مشقیں شامل کی گئی ہیں تاکہ طالب علم کسی پریشانی میں نہیں پڑے۔

بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ کی جانب سے میں ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، بہار کے ڈائرکٹر، بہار اسکول اگزامینیشن بورڈ، (سینیر سکنڈری) کے ڈائرکٹر (اکادمک) اور نصاب اور درسی کتاب کے مرتبین اور دیگر معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی وجہ سے بروقت کتاب تیار ہو کر منظر عام پر آسکی۔

دلیپ کمار LTS

مینیجنگ ڈائرکٹر، بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ، پٹنہ

چند الفاظ ۔ نئے نصاب اور درسی کتاب کے بارے میں

نویں درجہ کے لیے اردو کی کتاب آپ کے سامنے ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں بہار کے اردو زبان کے دانش وروں کی ایک ٹیم نے چھ ماہ کی مدت تک شب و روز عرق ریزی کی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ نویں درجہ کے طلبا کے ذہنی معیار کے پیش نظر تمام اصناف ادب سے نئے نئے اسباق شامل کیے جائیں اور طلبا کے لیے کارآمد متن کی تلاش کی جائے۔ متن کے انتخاب میں بھی اس بات کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ طلبا اور اساتذہ کو درس و تدریس کے دوران جدّت اور تازگی کا احساس ہو اور طلبہ کے ذہن میں اردو زبان دانی کا ذوق و شوق پیدا ہو۔

درسی کتابوں کی ترتیب اور متن کے انتخاب میں مرتبین کا میلان روایتی رہا ہے۔ اس میلان سے قدرے انحراف کرتے ہوئے متن کے انتخاب و ترتیب میں جدید دور، بدلتے ہوئے تعلیمی ذوق وغیرہ عوامل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے تا کہ طلبا نہ صرف یہ کہ تعلیمی مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیں بلکہ بدلتے ہوئے حالات سے اپنے آپ کو ذہنی طور پر ہم آہنگ کر سکیں اور وہ اپنے عہد کی زبان سے اچھی طرح روشناس ہو جائیں۔ کیوں کہ گذرتے ہوئے وقت اور بدلے ہوئے حالات میں زبان کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں اس بات کی بھی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اردو ادب کے مختلف ادوار کے مصنفین کی تخلیقات جگہ پا جائیں۔ چنانچہ قدیم، جدید اور کلاسیکل ہر دور کی تخلیقات اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اردو شاعری کے حصے میں اگر ایک طرف فائز دہلوی جیسے قدیم شاعر کا کلام شامل ہے تو دلاور فگار جیسے جدید شاعر کی طنزیہ نظم بھی شامل ہے۔ اس طرح جدید و قدیم میں توازن قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

تعلیم کی آفاقی اہمیت کے پیش نظر قومی تعلیم سے متعلق سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کا ایک خطبہ شامل کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی موضوع پر علامہ شبلی نعمانی کا ایک تحقیقی مضمون بھی ہے جس سے طلبا علم کی اہمیت اور قدر و قیمت سے آشنا ہو سکیں گے۔ اردو کی تخلیقی نثر میں چار افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں کرشن چندر کا ایک افسانہ ہے۔ دوسرا افسانہ شکیلہ اختر کا ہے (جس سے خواتین کی ادب میں نمائندگی ہوتی ہے)۔ تیسرا افسانہ فرانسیسی زبان سے ترجمہ شدہ ہے جو 'آخری سبق' کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ کہانی درس و تدریس ہی سے متعلق ہے۔ اس کہانی سے طلبا کو درس کے عملی پہلو کا تجربہ

حاصل ہوگا۔ چوتھا افسانہ بھی غیر ملکی زبان سے ترجمہ شدہ ہے اور سائنسی تحقیق سے متعلق ہے۔ اس افسانے کی شمولیت کا مقصد مادری زبان میں سائنسی علوم سے طلبا کو آشنا کرانا ہے۔ اس طرح افسانوں کے انتخاب میں مختلف طبقوں، علاقوں اور زبانوں میں مطابقت کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کی پیش کش اگر چہ صوبۂ بہار کے طلبا کے لیے مخصوص ہے لیکن کوشش یہ کی گئی ہے کہ یہاں کے طلبا کو بہار کے باہر یہاں تک کہ بیرون ملک کے ادبا و شعرا سے بھی روشناس کرایا جائے۔ اب تک کی کتابوں کی ترتیب میں یہ عام رجحان رہا ہے کہ مختلف عہد کے مخصوص ادبا و شعرا شامل نصاب کیے جاتے رہے ہیں لیکن اس کتاب کی تیاری میں تمام عہد کے تمام طبقوں کے ادبا و شعرا کی شمولیت کو یقینی بنایا گیا ہے۔ جیسے ناول میں رتن ناتھ سرشار کے ناول 'فسانہ آزاد' کا ایک باب پیش کیا گیا ہے تاکہ سرشار کی کلاسیکی نثر سے بھی طلبا کی آشنائی ہو سکے۔

اردو نثر کی بعض اصناف ایسی ہیں جن سے ہائی اسکول کے طلبا اب تک ناواقف رہتے ہیں جیسے خودنوشت اور سفرنامہ۔ اس کتاب میں ابن انشا کے سفرنامے کا ایک باب شامل کیا گیا ہے اور بیگم انیس قدوائی کی خودنوشت کا ایک حصہ شامل ہے جس سے قدوائی خاندان کی ملکی خدمات سے واقفیت ہوتی ہے۔

بہار کے نصاب میں پہلی بار تجربہ کیا گیا ہے کہ متن کے ساتھ تفصیلی مشقیں بھی دی جائیں تاکہ طلبا مشقوں کے حل کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ الفاظ و معانی سے واقف ہو سکیں اور ان کی زبان دانی کی صلاحیت میں اضافہ ہو۔ اس کوشش میں اگر کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہو گیا ہے تو اس کا مقصد بچوں کے لیے کتابوں کا بوجھ بڑھانا نہیں بلکہ درسی کتابوں کو آسان دلچسپ اور عام فہم بنانا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب کے نتیجے میں اب اساتذہ کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں کہ وہ طویل مشقوں کو حل کرانے میں طالب علموں کی مدد کریں۔

اس کتاب کی ترتیب میں موضوعات کے انتخاب اور ہمارے طویل مدتی مقاصد کو اگر ہمارے ذہین طلبا نے سمجھ لیا تو اس کو ہم اپنی کامیابی تصور کریں گے۔

حسن وارث
ڈائرکٹر (انچارج)
ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، بہار، (پٹنہ)

نگراں کمیٹی برائے درسی کتاب (اردو)

زیر سرپرستی

حسن وارث، ڈائرکٹر، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

رگھوونش کمار، ڈائرکٹر (اکادمک)، بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ، (سینیر سکنڈری)، پٹنہ

ڈاکٹر سید عبدالمعین، صدر، ٹیچر ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

ڈاکٹر قاسم خورشید، صدر، لینگویجز ڈپارٹمنٹ، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

مرتبین

پروفیسر اعجاز علی ارشد، صدر، شعبۂ اردو، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ

پروفیسر علیم اللہ حالی، سابق صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

ڈاکٹر جاوید حیات، صدر، شعبۂ اردو، بی این کالج، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ

ڈاکٹر ثریا جبیں، سابق صدر، شعبۂ اردو، پٹنہ کالج، پٹنہ یونی ورسٹی

ڈاکٹر شکیل قاسمی، لکچرر، اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی

فخرالدین عارفی، استاد، چھجو باغ ہائی اسکول، فتح پور، پٹنہ

محمد افتخار اکبر، استاد، آر جے ہائی اسکول، کیوٹی، دربھنگہ

حسن احمد، لائبریرین، گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ

ڈاکٹر نثار احمد فیضی، استاد، ذاکر حسین +۲ اسکول، سلطان گنج، پٹنہ

نظر ثانی (سینئر سکنڈری)، بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ

ڈاکٹر محمد حامد علی خان، صدر، شعبۂ اردو، پی جی، آر اے این، حاجی پور (ویشالی)

ڈاکٹر محمد منظرالحق، صدر، پوسٹ گریجویٹ، شعبۂ اردو، اے این کالج، پٹنہ

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، لکچرر، شعبۂ اردو، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ

اکادمک تعاون

امتیاز عالم، لکچرر، لینگویجز ڈپارٹمنٹ، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

ڈاکٹر سریندر پال، لکچرر، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار

اکادمک، کنوینر

گیان دیومنی ترپاٹھی، ماہر تعلیم

فہرست

حصۂ نثر

انشائیہ [1-11]

- ہیرو — سید محمد حسنین — 4

افسانہ [12-48]

- پورے چاند کی رات — کرشن چندر — 14
- شاید — شکیلہ اختر — 28
- آخری سبق (فرانسیسی کہانی) — الفانسو داوے — 35
- بادِ پیا کی یہ دلربا کہانی (سائنس فکشن) — سکلف اینڈ سکلف — 42

ناول [49-58]

- عبرت اور نصیحت — رتن ناتھ سرشار — 51

مضمون [59-66]

- تعلیم قدیم و جدید — شبلی نعمانی — 61

ترجمہ نگاری [67-74]

- مغربی انشائیے (ترجمہ) — اندر جیت لال — 68

سفرنامہ [75-80]

- فلپائن کا سفر۔1967 — ابن انشا — 77

خودنوشت [81-97]

• قدوائی خاندان		بیگم انیس قدوائی	83
• میرا ادبی سفر		عصمت چغتائی	88

خاکا [98-103]

• مولانا ولایت علی		ماخوذ	99

خطبہ [104-109]

• قومی تعلیم		ڈاکٹر ذاکر حسین	106

حصۂ شاعری

نظم [110-139]

• انتخاب از مسدس حالی		الطاف حسین حالی	112
• پرچھائیاں		ساحر لدھیانوی	117
• یہ ہے میرا ہندوستان		زبیر رضوی	124
• آج کا اسٹوڈنٹ	(ظریفانہ نظم)	دلاور فگار	131
• نغمۂ آزادی	(ترجمہ)	سبراتیم بھارتی	137

قصیدہ [140-144]

• طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع		ابراہیم ذوق	143

مرثیہ [145-155]

• بیان شہادت حُر		سلامت علی دبیر	147
• رخصت حضرت عباس		شاد عظیم آبادی	153

غزل [156-182]

• جانِ ایامِ دلبری ہے یاد	فائز دہلوی	158
• اے خوب رو فرشتہ صفت انجمن میں آ	فائز دہلوی	158
• تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے	خواجہ میر درد	163
• تجھی کو جو یاں جلوہ فرماں نہ دیکھا	خواجہ میر درد	163
• کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں	علامہ اقبال	168
• ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں	علامہ اقبال	168
• بقدرِ پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا	جمیل مظہری	174
• صبح خود بتائے گی، تیرگی کہاں ہے	جمیل مظہری	174
• سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے	بسمل عظیم آبادی	179
• تجھے خبر بھی ہوئی یا نہیں ہوئی اے دوست	بسمل عظیم آبادی	179

گیت [183-187]

• گیت ہمارے سب کے لیے ہیں کیا اپنے کیا غیر	بیکل اتساہی	185

رباعی [188-205]

• ہر تن میں نہاں ہے جس نے بخشی ہے جاں	تلوک چند محروم	190
• ضد، جہل، حسد، بغض، عداوت، کینہ	طلحہ رضوی برق	196
• یہ کیا کہ حیات جاودانی کیا ہے	جگت موہن لال رواں	201

قطعہ [206-211]

ان آنسوؤں کو پینے دیا نہ تمام میں نے	اختر انصاری	208

انشائیہ

انشائیہ اردو نثر کی نسبتاً جدید صنف ہے۔ ابتدا میں ہلکے پھلکے مضامین کو انشائیہ کے زمرے میں رکھا گیا لیکن رفتہ رفتہ انشائیہ کے خدوخال صنف کے طور پر طے ہوتے چلے گئے۔ اردو میں انشائیہ کی تاریخ صرف 35 سال پرانی ہے۔ مشہور ناقد اور انشائیہ نگار ڈاکٹر جانسن کے الفاظ میں :

'انشائیہ ایک ذہنی ترنگ ہے جس میں بے ترتیب، غیر منضبط اور ناپختہ خیالات اور جذبات کا اظہار ہو۔'

کہا جاتا ہے کہ اردو میں انشائیہ کا ظہور مغربی ادبیات کے حوالے سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو انشائیہ نے مغرب کے انشائیوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے دائرہ کار میں بھی کافی وسعت پیدا کی ہے مثلاً یہ کہ انشائیہ میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہونا چاہیے۔ انشائیہ میں کہانویت کفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو انشائیہ عصری شعور کی ترجمانی کرنے کے علاوہ کائناتی شعور کا بھی اظہار کر رہا ہے۔ زمان و مکان کے سوالات بھی انشائیہ میں جگہ پانے لگے ہیں جو ذہنی بلوغیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

سیّد محمد حسنین

سید محمد حسنین 2 راکتوبر 1920ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب خانوادۂ امام تاج فقیہ سے ملتا ہے۔ راجہ رام موہن رائے سیمنری اسکول سے میٹرک اور پٹنہ یونی ورسٹی سے 1946ء میں ایم۔ اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ 1956ء میں بہار یونی ورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے ریاست بہار میں اردو کی پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری لینے کا امتیاز حاصل کیا۔ 1968ء سے 1985ء تک مگدھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس دوران کثرت سے علمی و ادبی مقالات ہند و پاک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ مگر جس کام نے انہیں شہرت اور مقبولیت عطا کی وہ صنف انشائیہ نگاری کے سلسلے میں لکھی گئی ان کی کتاب ہے۔ یہ کتاب 'صنف انشائیہ اور چند انشائیے' کے نام سے پہلی بار 1958ء میں شائع ہوئی اور اس کا چھٹا ترمیم شدہ اڈیشن 'انشائیہ اور انشائیے' کے زیر عنوان 1997ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب میں محمد حسین آزاد سے لے کر شفیقہ فرحت تک کل ستائیس انشائیہ نگاروں کے مضامین شامل ہیں۔ ایک مضمون ح۔م۔ اسلم عظیم آبادی کے نام سے خود سید محمد حسنین کا بھی ہے۔ وہ ابتدا میں اسی نام سے مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس کتاب کے علاوہ انہوں نے تقریباً دو درجن کتابیں لکھی ہیں اور کچھ مفید خاص نمبر نکالے ہیں۔ حسنین صاحب ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد پٹنہ میں رہنے لگے تھے مگر اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کے گھر دہلی، علی گڑھ اور کراچی وغیرہ آتے جاتے رہتے تھے۔ اکتوبر 1999ء میں پاکستان گئے تھے۔ وہیں انتقال ہوگیا اور اسلام آباد میں مدفون ہوئے۔

سید محمد حسنین نے خاکے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ انہوں نے مگدھ یونی ورسٹی سے ایک رسالہ 'مشام' کے نام سے نکالا تھا جس کی ریسرچ کے اعتبار سے اہمیت تھی مگر اردو میں Light Essay کو انشائیہ کے نام سے متعارف کرانے کا اہم کام ہی انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انشائیہ کس طرح افسانہ، مقالہ یا ظریفانہ مضمون سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں مختلف طرح کے موضوعات ملتے ہیں مگر انداز بیان میں زیادہ فرق دکھائی نہیں دیتا۔ نہ صرف بہار میں بلکہ پوری اردو دنیا میں ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے وہ معروف اور مقبول رہے ہیں۔ ان کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ 'نشاطِ خاطر' بہت مقبول رہا ہے۔

ہیرو

مرزا غالب کو آم بہت پسند تھے۔ آپ ناواقف نہ ہوں گے ۔۔۔ اچھے آم کی تعریف انہوں نے یوں کی تھی ک بہت سے ہوں اور خوب میٹھے ہوں۔ آپ کی پسند اور ناپسند مجھے نہیں معلوم۔ مگر آپ جانتے ہوں گے کہ آم نہ پسن کرنے والوں کو غالب گدھے سمجھتے تھے۔ ہیرو کی پسند کا اظہار کر کے مجھے اس وقت آپ کی شناخت منظور نہیں۔

کھٹے میٹھے آم کی طرح ہیرو بھی خالصاً دو ہوتے ہیں، مثالی اور موسمی۔ اسے اپنے ملک کی خوش قسمتی کہیے ک ہمارے پھلوں میں جتنی شکل اور سواد کے آم ملتے ہیں، اتنی اقسام کے ہیرو بھی۔ مثال کے طور پر فلمی ہیرو اور قو ہیرو، کلاس کا ہیرو اور بازار کا ہیرو، محلّہ کا ہیرو اور میچ کا ہیرو وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہیرو کسی جگہ اداکاری کرتا ہے، کہیں س بازی، کہیں یہ کامریڈ کہلاتا ہے، کہیں رنگ دار، کہیں سرداری کرتا ہے، کہیں سواری، کہیں اس کا شغل پہلوانی ہوتا۔ اور کہیں عاشقی۔ جہاں زندگی کی علامت ہے وہاں ہیروازم کی علّت۔ جہاں زندگی کا سوز وساز ہے، وہاں ہیرو ا کی تب وتاب۔ کوئی جگہ ہیرو سے خالی نہیں۔ ہر دل میں ہیروشپ کا جذبہ اور جوع موجود ہے۔

ہیرو طبعًا دو ہوتے ہیں۔ مثالی اور موسمی۔ مثالی ہیرو کتابی دنیا میں نشوونما پاتا ہے اور عموماً یہ زائیدہ خیال ہے۔ نامی شعرا اور کہانی کار اس کے خالق ہوتے ہیں۔ اسی کے دم قدم سے اہل قلم کو مقام ابدی نصیب ہوتا نیرنگیٔ زمانہ سے مثالی ہیرو اگر کبھی اس عالم رنگ میں نمودار ہو جاتا ہے تو اس کا قیام اور قیادت معاشرہ کے لیے پُر ہو جاتی ہے۔ اس کی سرفرازیاں جو اس کی ہیروازم کو نادرالوجود بنا دیتی ہیں اس کے اقوال واعمال کی زرّینی ہیں۔ مرنے کے بعد اس ہیرو کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر اتباع وتوقیر کے نام پر اس کی قدریں بے قدر کی ہیں۔ 'پیراں نمی پرند مریدانِ می پرانند' کے مصداق اس مردِ آہن کے کردار سے زیادہ اس کی ذات کو مرکز رکوع بنا لیا جاتا ہے۔ مثالی ہیرو اللہ کا پیارا ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے مقلدین وتابعین خرافات کے ظلم میں ذرۂ نور تلاش کرتے رہتے ہیں۔

بعض مثالی ہیرو ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے وقت یا قبل از وقت صفحۂ ارض پر نمودار ہو جاتے ہیں اور فکر و

کے عرفان کی نافہمی اور بلا خیز روشنی طبع کی وجہ سے وہ خود آپ شکار ہو جاتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے برگزیدہ ہیرو کو ارباب قضا و قدر جلد از جلد عالمِ ہستی سے عالمِ نیستی میں واپس کر دیتے ہیں۔

مثالی ہیرو کا انجام، خواہ یہ زائیدہ قلم کار ہو یا پروردۂ قدرت، عموماً المیہ ہوتا ہے۔ اپنی الم ناکی کے باوجود یہ دست فنا سے محروم رہتا ہے۔ مثالی ہیرو کے المیہ کا یہی رخ طرب ناک اور درخشاں ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی ہیروازم کلاسیکی بن جاتی ہے۔

عصر جدید کا ہیرو کلاسیکی ہیرو سے زیادہ حوصلہ مند اور فعال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے مزاج اور ماحول کی ہم رنگی ہے۔ لڑکپن سے پہلے اس میں عاشقی کا مادّہ اور جوانی سے پہلے حسینوں پر مرنے کا حوصلہ آ جاتا ہے— چلتے پھرتے ایجاب و قبول کی خاطر وہ ہمہ وقت اوٹو رکشا بنا رہتا ہے۔ اظہارِ عشق کا مرحلہ ہو یا ترسیل عشق کا مسئلہ۔ وہ ہمیشہ ترقی پسندانہ انداز سے سوچتا اور غیر روایتی طریقہ کار کو اپناتا ہے۔ مثلاً وہ پتنگ بازی یا غزل گوئی نہیں کرتا۔ وہ کبوتر یا ملازمہ کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ مٹھائی یا چٹھی کا بھی قائل نہیں ہوتا۔ رہی مصوری اور افسانہ نگاری تو ان وسائل کا استعمال اس کے لیے امر محال ہے کہ اب افسانہ اور تصویر دونوں تجریدی آرٹ ہو گئے ہیں۔ لازماً سرخ روئی یا زرد روئی کے انجام سے بے پروا ہو کر وہ آتشِ عشق میں بے خطر چھلانگ لگا دیتا ہے کہ میر صاحب فرما گئے ہیں ۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت، نہ ہوتا ظہور

عصر جدید کے ہیرو کے سفلہ پن پر غصہ کے عوض مجھے ترس آتا ہے۔ آپ بھی میرے ہم خیال ہوں گے کہ اس کی ہیروازم کی نامعقولیت دراصل ہمارے نظامِ تعلیم اور طریقہ تربیت کا ثمرہ ہے۔ غور فرمائیں، اب نہ مکتبی اور مذہبی تعلیم ہے اور نہ درس گاہوں میں چٹائی اور چھڑی۔ مخلوط تعلیم اور سیکولرزم کا دار و دورہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے آغاز سے بہت پہلے بچہ کی دنیائے مشاہدہ میں وہ چمک دار رنگین تصویریں داخل ہو جاتی ہیں جو والدین کے ذوق اور کمروں کی زینت کا ثبوت رہتی ہیں— بچہ کی تجسس پسند نظریں ان ماہ پیکر کے عریاں جسم کے جغرافیہ کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ گھر اور باہر، بازار یا تقریب کی کوئی قید نہیں۔ مرمٹنے کی دعوت اسے ہر جگہ ملتی ہے۔ وہ جنسی کہانیاں دیکھتا اور پڑھتا ہے۔ پڑھتا بہت کم ہے کہ دیکھنے سے ہی اسے فرصت نہیں ملتی۔ عمر آتے ہی کالج کی کھلی فضا میں اس کی ہیروازم تازہ دم ہو جاتی ہے جو دل پر گزرتی ہے حیوانی عمل سے اس کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ آخرش، بد اقبال والدین اور

نامراد اولاد بعد عفتِ بسیار ایک ہی گھاٹ پر جا لگتے ہیں یعنی آپ کی ہمدردی پر ہائے دل اور ہائے گل دونوں کے لب پر ہوتے ہیں۔

خدا بخشے لکھنؤ کے اگلے لوگ کیسے روشن دماغ اور دور بین تھے۔ ان کی نفاست پسندی اور جدت پرستی کا جواب نہیں۔ ادب اور تہذیب کو اس لکھنوی زندہ دلی سے کیا کچھ نہ ملا۔ ریختہ کو ریختی، قیصر باغ کو راجا اندر کا دربار بنا کر اور بلبل کو مذکر باندھ کر انہوں نے دلی والوں کو نئے مقامات آہ و فغاں سے روشناس کرایا۔ اور تو اور نہایت دور افتادہ ماضی کے ایک تہذیبی مشغلہ کو انہوں نے یوں اپنا لیا کہ نقل اصل سے دو ہاتھ آگے بڑھ گئی— قدیم روم اور یونان کے جری سورماؤں کے قصے آپ نے پڑھے ہوں گے۔ یہ خوں خوار اور گرسنہ درندوں سے کشتی لڑتے، پینترے بدل بدل کر اپنی شجاعت کے مظاہرے کرتے۔ حیات و موت کی کشتی کا یہ روح فرسا تماشا رومی اور یونانی فرماں رواؤں کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اس کشتی سے جاں بازی کا جیسا بھی مظاہرہ ہوتا ہو، پر صاحب! یہ مشغلہ کسی کی جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری والا ایک طرفہ معاملہ تھا۔

آفریں بر اہل لکھنؤ! اس رومی روایات کی لکھنوی مذاق نے بیخ کنی کر دی۔ ان کی توجہ سے اس کشتی کی نہ صرف بہیمیت دور ہوئی بلکہ اس میں جدت اور نفاست بھی آ گئی۔ یعنی ایک طرف انہوں نے انسان اور درندوں کی بجائے بٹیر اور مرغ کی کشتی رائج کی۔ دوسری طرف دو پہلوانوں کو اکھاڑے میں اتارنے کے عوض انہیں بیٹھے بیٹھے چونچ لڑانے کا ہنر سکھا دیا۔ کیسا قلب گداز پایا تھا انہوں نے! بھلا درندہ اور دو پایہ کا مقابلہ کیا؟ حیوان دونوں ہی ٹھہرے۔ لکھنؤ کے اگلوں نے مگر ایسے سورما تیار کیے جو پہلوانوں سے 'بانکے' ہو گئے۔ ایسے مست پہلوان جن کی لنگوٹ اتر گئی اور مونچھ اٹھ گئی! ان کا جسم پہلوانی نہ رہا، پر ان میں کس بل آ گیا— دیکھا آپ نے؟ لکھنؤ کے یہ بانکے بھی دراصل ہیرو کی ایک قسم تھے۔ یہ بانکے اس عہد کی تہذیبی جاہ و جمال کی مجسم تصویر تھے۔ ان بانکوں کی ہیروازم سے مجمع اور مجلس میں بادِ نشاط بہنے لگتی اور بجھے دل بھی کھل جاتے۔

کہتے ہیں، لکھنؤ اسٹیشن سے دو بانکے بغرض سفر یکے بعد دیگرے ایک ہی ڈبے میں داخل ہوئے۔ ان کی نظریں ملیں۔ جو بیٹھ چکا تھا جم کر بیٹھ گیا جو آیا وہ واپس نہ ہوا کہ بانکپن دونوں کو عزیز تھا۔ ٹرین روانہ ہوئی۔ مسافر خوش ہوئے کہ ان بانکوں کی آمد سے خوش وقتی نصیب ہوئی— زانو پر زانو رکھے آمنے سامنے سیٹ پر باطمینان بیٹھے دونوں بانکوں نے اپنی لن ترانی شروع کر دی۔ مسافروں کو اپنے شیوہ و شعار سے فریفتہ و متوجہ کرتے ہوئے یہ اپنے

اپنے مربی کے بے مثل اعزاز و افتخار پر دون کی ہانکنے لگے۔ ان کے مکالمے نہلے پر دہلے کی بازی کھیلنے لگی۔ پر نچلا کوئی نہیں بیٹھا۔ کچھ دیر بعد اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اتفاق وقت، دونوں بانکوں کو اسی جگہ پر اترنا تھا۔ اپنی مرصع چھڑی لیے یہ پلیٹ فارم پر آ گئے۔ اِدھر اُدھر قلی گھوم رہے تھے۔ ایک بانکے نے پاٹ دار آواز سے قلی کو پکارا۔ دوسرے بانکے نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ سامان ندارد، پھر قلی چہ معنی؟ وہ نہ دیکھے انداز سے اس بانکے کا جائزہ لینے لگا۔

پہلے بانکے نے نہایت تمکنت کے ساتھ قلی کی طرف اپنی چھڑی بڑھائی اور کہا۔ 'دیکھتا کیا ہے؟ لے یہ چھڑی اٹھا۔' بانکپن کا یہ مظاہرہ دوسرے کو زک دے گیا۔ دل ہی دل میں وہ تلملا گیا، جیسے اس کی کور دب گئی۔

اچانک چھٹی حس نے اسے سہارا دیا۔ اس نے بھی 'قلی قلی' صدا لگائی۔ ایک قلی دوڑ کر آیا۔ پاس آ کر بولا۔

'نواب صاحب! سامان کہاں ہے؟'

بانکے نے کام دار صدری کی جیب میں سے نہایت فخر سے دو انگلی داخل کی۔ ٹکٹ نکالتے ہوئے قلی کو حکم دیا۔

'نواب کے بچے! لے یہ ٹکٹ اٹھا۔'

آج کا ہیرو بانکا سجیلا نہیں ہوتا۔ اس کو ہیروازم کو دیکھنے یا سننے کا جی بھی نہیں چاہتا۔ یہ نہ مثالی ہوتا ہے اور نہ کتابی۔ یہ فصلی ہوتا ہے اور موسم موسم میں تولد ہوتا ہے— میں یہ مشاہدہ نہ کر سکا ہوں کہ موسمی ہیرو کی اچھی فصل مناسب فضا کا نتیجہ ہوتی ہے یا نامناسب فضا میں اس کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔ پر اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عصری بحران اور انتشار موسمی ہیرو کی نشوونما کے لیے نہایت سازگار ہیں۔ معاملۂ تولید میں ان کی آمد یا آورد کا گوشوارہ بنانا اچھے اچھے دانشوروں کے لیے بھی مشکل ہے۔

موسمی ہیرو کھٹرے اسٹیم انجن کے بھبکتے دھواں کی طرح اچانک ابھرتا ہے۔ اس کی ہیروازم کے کارناموں سے شرفاء گھر کے اندر اور سفلاء گھر کے باہر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بلا درِ دسرا اکثریت کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ بامراد ہونے سے پہلے وہ یوں اینٹھنے لگتا ہے جیسے نیا ملازم نیا بش شرٹ پہن کر ملکیتی کے ساتھ بازار کو نکلا ہو!

موسمی ہیرو کدو کریلے کی لتوں کی مانند تیزی سے بڑھتا ہے۔ زیادہ دن تک ہرا بھرا نہیں رہتا۔ کامرانیاں سترہوں یا سینکڑوں، یہ جلد اپنے رنگ بدل دیتا ہے۔ توبہ استغفار کر کے یہ زیارت کو نکل جاتا ہے۔ واپسی کے بعد پھر

یہ شرعی ہیرو بن جاتا ہے۔ فتنہ اور فتور کی دنیا سے منہ موڑ کر وہ خیر و خدمت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ روایتی رسوم کے اجرا اور چلتے پھرتے عقائد کے راستے پر شرعی ہیرو کا یقین نہایت کامل اور پختہ ہوتا ہے۔ محلہ یا برادری کے ان روشن خیال طلبا کی عقل پر وہ دست تاسف ملا کرتا ہے جو کارخانہ قدرت کو اندھے کی لاٹھی تصور کرتے ہیں— یہ نو عمر دانش دراصل نہایت حساس ہوتے ہیں۔ امت محمدیہ کے زوال وادبار اور امم ہائے موسیٰ و عیسیٰ کے ظفر اقبال کا راز ان کی کچی فکر و فہم کے لیے ایک پرابلم ہوتا ہے شرعی ہیرو کو طلبہ کے اس منشیانہ نقطۂ نظر سے اختلاف رہا ہے۔ اعتراف اسے بھی ہوتا ہے کہ ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر ہے۔ پر اسے یقین ہوتا ہے کہ قیامت قریب ہے۔ نماز پڑھو۔ اللہ کو یاد کرو۔ سب ٹھیک رہے گا— یہ ایمان پرور اور ایمان سوز تقابلی بحثیں بڑی دل چسپ ہوتی ہیں۔ مداخلت کیے بغیر اس محاکاتی مناظرے سے لطف اندوز ہونے کا مجھے موقع ملا ہے اور ایسا محسوس ہوا ہے جیسے منا ڈے اقبال کا 'شکوہ' اور محمد رفیع 'جواب شکوہ' خود رفتہ ہو کر سنا رہے ہوں۔

لفظ و معنی

ناواقف ہونا	۔	نہیں جاننا
اقسام	۔	قسم کی جمع
سواد	۔	مزہ۔ ذائقہ
شغل	۔	کام
علامت	۔	نشان، پتہ، سراغ، کھوج، اشارہ
علّت	۔	بیماری، دکھ، سبب، بری عادت، لت
جوع	۔	بھوک
زائیدہ خیال	۔	خیال کی پیداوار
ابد	۔	ہمیشہ رہنے والا
قیادت	۔	لیڈرشپ۔ رہنمائی
اتباع	۔	پیروی، تقلید، رہنمائی قبول کرنا
صفحۂ ارض	۔	زمین، دنیا

نافہمی	۔	ناسمجھی
عالم ہستی	۔	ہماری دنیا
عالم نیستی	۔	آخرت، عدم
المیہ	۔	ٹریجڈی
فعال	۔	بہت کام کرنے والا، سرگرم
سفلہ پن	۔	کمینگی، چھچھورا پن
آہ وفغاں	۔	رونا پیٹنا، نالہ وفریاد
بیخ کنی کرنا	۔	جڑ کھودنا
بہیمیت	۔	حیوانیت، وحشی پن
تولد ہونا	۔	پیدا ہونا
بحران اور انتشار	۔	ہلچل، بکھراؤ
محاکات	۔	باہمی بات چیت، ایک دوسرے سے مشابہ ہونا، کسی چیز یا حالت کی نقل کرنا (الفاظ کے ذریعہ منظر نگاری)
ہمہ آفاق پر از فتنہ وشر	۔	پوری دنیا فتنہ وفساد سے بھری ہے
لطف اندوز ہونا	۔	لطف اٹھانا، مزہ لینا

آپ نے پڑھا

- گذشتہ صفحات میں آپ نے سید محمد حسنین کا ایک ظریفانہ مضمون 'ہیرو' پڑھا۔ اس میں خیال کی جو آزادروی اور شگفتگی ہے اس کے سبب اسے انشائیہ کی صف میں رکھا جاتا رہا ہے۔ حسنین صاحب نے ظاہری طور پر ایک عنوان قائم کرکے اس کے وسیلے سے بہت سارے پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔ ان میں ایسے بھی پہلو ہیں جن کا عنوان سے براہ راست اور سیدھے طور پر کوئی تعلق نہیں ہے مگر انشائیہ نگار بات سے بات پیدا کرتے ہوئے ادھر ادھر بھی نکل جاتے ہیں اور ہم اس آزاد خیالی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔
- مضمون نگار نے اپنی بات مرزا غالب کے تذکرے سے شروع کرتے ہوئے مشہور نکتہ دہرایا ہے کہ مرزا کو آم بہت پسند تھے۔ پھر فوراً ہی آم اور ہیرو میں ایک رشتہ تلاش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ کھٹے اور میٹھے آموں کی طرح ہیرو بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک مثالی اور دوسرے موسمی۔ پھر مختلف قسم کے ہیرو کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ

مثالی ہیرو اور موسمی ہیرو میں کیا فرق ہے۔ اور دونوں پر دنیا میں کیا گزرتی ہے۔

- مثالی اور موسمی ہیرو کا تذکرہ کرتے ہوئے مضمون نگار موجودہ زمانے کے ہیرو یعنی نوجوانوں کی طرف آتے ہیں اور اس زمانے میں جس طرح نوجوانوں پر عشق کا بھوت سوار ہے اس پر اپنے غصے اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے درس گاہوں کی غلط تعلیم کو ساری برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ نوجوانوں کی اس بے راہ روی کے لیے کچھ ذمہ داری ان کے والدین کی دی ہوئی غلط تربیت کی بھی ہے جس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں۔
- دورِ حاضر کے نوجوان ہیرو کا تذکرہ ختم کرتے ہی مضمون نگار ماضی میں لوٹ جاتے ہیں اور مثالی ہیرو کے طور پر لکھنو کے ان زندہ دلوں اور بانکوں کو پیش کرتے ہیں جنہوں نے ابتدا میں تو اپنی جاں بازی کے خوب جوہر دکھائے مگر آگے چل کر وہ بھی فضول قسم کے تکلف ورسم ورواج میں مبتلا ہو گئے۔
- ایک بار پھر مضمون نگار مثالی ہیرو اور موسمی ہیرو کا مقابلہ کرتے ہوئے نئے زمانے کے ان لوگوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو کسی خاص واقعے کے سبب یکا یک نمایاں ہو جاتے ہیں اور اپنی شہرت، عزت یا دولت پر اتراتے ہوئے نمونۂ عبرت بن جاتے ہیں۔ اصل میں جو کچھ انہیں ملتا ہے وہ ان کی عام شخصیت سے میل نہیں کھاتا اور ایسا لگتا ہے جیسے مناڈے اقبال کا 'شکوہ' یا محمد رفیع 'جواب شکوہ' سنا رہے ہوں۔
- یہ ساری باتیں پیش کرتے ہوئے مضمون نگار اپنے پڑھنے والوں کی سوچ سمجھ اور ذہنی سطح سے قریب رہتے ہیں اور کوئی ایسی گہری یا علمی بات نہیں کہتے جو سننے والے کے سر سے گزر جائے۔ ہلکے پھلکے تفریحی انداز میں طنز وظرافت کے حربوں سے کام لیتے ہوئے انہوں نے اپنی بات مکمل کر دی ہے جو آپ کو اچھی لگتی ہے۔ اور آپ یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ بات کچھ دیر اور جاری رہتی تو کچھ برا نہ ہوتا۔

آپ بتائیے

1. 'ہیرو' کس طرح کا مضمون ہے اور کیوں؟
2. ہیرو کتنی طرح کے ہوتے ہیں؟
3. مرزا غالب اور آم کے بارے میں مضمون نگار نے کیا لکھا ہے؟
4. مضمون میں لکھنؤ کے بانکوں کے بارے میں کون سا واقعہ آپ کو پسند آیا؟
5. موسمی ہیرو عمر کے آخری حصے میں کیا کرتا ہے؟
6. مثالی اور موسمی ہیرو میں کیا فرق ہوتا ہے؟

مختصر گفتگو

1. مرزا غالب نے اچھے آم کے بارے میں کیا کہا تھا؟

(الف) بہت سے ہوں (ب) بہت سے ہوں اور خوب میٹھے ہوں

(ج) بہت کم ہوں (د) بہت کھٹے ہوں

2. ہیرو کتنی طرح کے ہوتے ہیں؟

(الف) دو (ب) تین (ج) پانچ (د) بے شمار

3. لکھنؤ کے دو بانکے کس طرح سفر کر رہے تھے؟

(الف) ہوائی جہاز (ب) بیل گاڑی (ج) تانگہ (د) ریل گاڑی

4. سفر کرنے والے دوسرے بانکے نے قلی کو کیا اٹھانے کے لیے کہا؟

(الف) اپنا سامان (ب) اپنی چھڑی (ج) اپنا ٹکٹ (د) اپنا جوتا

5. موسمی ہیرو کس تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے؟

(الف) درخت کی طرح (ب) کدو کریلے کی لت کی طرح

(ج) گناہ کی طرح (د) پھولوں کی طرح

تفصیلی گفتگو

1. سید محمد حسنین کے مضمون کی اہم باتیں اپنی زبان میں لکھیے۔
2. مضمون نگار نے مثالی ہیرو کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے مختصراً بیان کیجیے۔
3. مضمون میں موسمی ہیرو کو کن کن چیزوں سے مثال دی گئی ہے؟ سمجھا کر بتائیے۔
4. لکھنؤ کے بانکوں کے بارے میں مضمون نگار نے کیا لکھا ہے؟
5. مضمون 'ہیرو' پڑھنے کے بعد آپ نے کیا محسوس کیا؟ اپنے لفظوں میں لکھیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. سید محمد حسنین کا کوئی اور مضمون تلاش کر کے پڑھیے اور دوستوں سے اس کے بارے میں بات چیت کیجیے۔
2. اپنے استاد سے لکھنؤ کے بانکوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے۔
3. اپنے دوستوں سے مشورہ کیجیے کہ مثالی ہیرو بننے کے لیے آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

افسانہ

اردو میں مختصر افسانہ مغربی ادب کی دین ہے۔ یہ جدید دور کی پیداوار ہے۔ عصر حاضر میں مصروف رہنے والوں کے لیے مختصر افسانہ، ناول اور داستان سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔

مختلف نقادوں نے اپنے اپنے طور پر افسانے کی تعریفیں بیان کی ہیں۔ ایک نقاد نے کہا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے۔ ایک اور نقاد کہتا ہے کہ افسانے میں بنیادی چیز وحدت تاثر ہے۔

ایک اچھا افسانہ اختصار کے ساتھ زندگی کے کسی گوشے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ افسانہ میں جھول ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں چونکہ یہ مختصر ہوتے ہیں۔ لازم ہے کہ افسانہ نگار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہونا چاہیے۔ کردار بھی ایسے ہوں جو ہماری زندگی اور تجربوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، موضوع، کردار، مکالمہ، منظر کشی، ماحول اور زبان و بیان کی رنگینیاں قابل ذکر ہیں۔

اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر اور انتظار حسین اہم ہیں۔ ان کے بعد اردو میں افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اس فن کو جلا بخشنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

کرشن چندر

کرشن چندر 23 نومبر 1914ء کو وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر بھرت پور اور پونچھ (کشمیر) میں میڈیکل افسر تھے۔ کرشن چندر کی ابتدائی تعلیم پونچھ (جموں کشمیر) میں ہوئی۔ 1930ء کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور گئے اور فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ 1934 میں پنجاب یونی ورسٹی سے انگریزی زبان میں ایم۔ اے کیا اور 1937ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ان کو ملازمت کے بندھن میں جکڑی زندگی پسند نہیں تھی۔ پھر بھی 1939ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں پروگرام اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت کی۔ ایک سال کے بعد دہلی اور پھر کچھ دنوں کے بعد آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں تبادلہ کرالیا۔ لاہور، دہلی اور لکھنؤ جیسے ادبی مقامات میں رہ کر ان کی زبان اور بیان میں نکھار اور ان کے ادبی ذوق و شوق میں غیر معمولی اضافہ پیدا ہوا۔

کرشن چندر نے ابتدا میں انگریزی زبان میں لکھنا شروع کیا لیکن پھر وہ اردو میں لکھنے لگے۔ 'ہمایوں' اور 'ادبی دنیا' میں ان کی کہانیاں شائع ہوئیں اور پھر وہ سدا کے لئے اردو کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے افسانوں کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے افسانوں کو اردو افسانوں میں اضافہ تصور کیا گیا اور کرشن چندر اردو دنیا کے ایک بے حد اہم افسانہ نگار بن گئے۔

لکھنؤ میں قیام کے دوران ہی ان کو شالیمار پکچرز کی جانب سے مکالمے لکھنے کی دعوت ملی اور وہ استعفا دے کر پونہ چلے گئے پھر بعد میں مستقل طور پر ممبئی میں سکونت اختیار کرلی۔ 1969 میں حکومت ہند کی جانب سے ان کو پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا اور دوسرے کئی اداروں کی طرف سے بھی ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

کرشن چندر کی تقریباً 80 کتابیں شائع ہوئیں۔ انہوں نے افسانوں کے علاوہ ناول، ڈرامے، رپورتاژ اور مضامین تحریر کیے۔ لیکن ان کی بنیادی حیثیت ایک افسانہ نگار کی ہے۔ ان کے ناولوں میں 'شکست'، 'جب کھیت جاگے'، 'دل کی وادیاں سو گئیں'، 'ایک گدھے کی سرگزشت'، اور 'آسمان روشن ہے' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 'شکست' کرشن چندر کا پہلا ناول ہے۔ کرشن چندر بنیادی طور پر ایک رومانی افسانہ نگار تھے۔ ان کی زبان نہایت خوب صورت اور سبک تھی اور اس میں جادو جیسا اثر تھا۔ کرشن چندر اپنی خوب صورت زبان اور معیاری تخلیقات کے لئے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے بڑے ممالک کی اہم زبانوں میں بھی ان کے افسانوں اور ناولوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ 8/ مارچ 1977ء کو ممبئی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

پورے چاند کی رات

اپریل کا مہینہ تھا۔ بادام کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئی تھیں اور ہوا میں برفیلی خنکی کے باوجود بہار کی لطافت آ گئی تھی۔ بلند و بالا تنگوں کے نیچے مخملیں دوب پر کہیں کہیں برف کے ٹکڑے سپید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اگلے ماہ تک یہ سپید پھول اسی دوب میں جذب ہو جائیں گے، اور دوب کا رنگ گہرا سبز ہو جائے گا، اور بادام کی شاخوں پر ہرے ہرے بادام پکھراج کے نگینوں کی طرح جھلملائیں گے اور نیلگوں پہاڑوں کے چہروں سے کہرا دور ہوتا جائے گا اور اس جھیل کے پل کے پار پگڈنڈی کی خاک، ملائم بھیڑوں کی جانی پہچانی باآ آآ سے جھنجھنا اٹھے گی، اور پھر ان بلند و بالا تنگوں کے نیچے چرواہے بھیڑوں کے جسموں سے سردیوں کی پلی ہوئی موٹی موٹی گف اون گرمیوں میں کترتے جائیں گے اور گیت گاتے جائیں گے۔

لیکن ابھی اپریل کا مہینہ تھا.. ابھی تنگوں پر پتیاں نہ پھوٹی تھیں۔ ابھی پہاڑوں پر برف کا کہرا تھا۔ ابھی پگڈنڈی کا سینہ بھیڑوں کی آواز سے گونجا نہ تھا۔ ابھی سمل کی جھیل پر کنول کے چراغ روشن نہ ہوئے تھے۔ جھیل کا گہرا سبز پانی اپنے سینے کے اندر اُن لاکھوں روپوں کو چھپائے بیٹھا تھا جو بہار کی آمد پر یکا یک اس کی سطح پر ایک معصوم اور بے لوث ہنسی کی طرح کھل جائیں گے۔ پل کے کنارے کنارے بادام کے پیڑوں کی شاخوں پر شگوفے چمکنے لگے تھے۔ اپریل میں زمستاں کی آخری شب میں جب بادام کے پھول جاگتے ہیں۔ اور بہار کے نقیب بن کر جھیل کے پانی میں اپنی کشتیاں تیراتے ہیں۔ پھولوں کے ننھے ننھے شکارے سطح آب پر رقصاں و لرزاں بہار کی آمد کے منتظر ہیں۔

پل کے جنگلے کا سہارا لے کر میں ایک عرصے سے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ سہ پہر ختم ہو گئی۔ شام آ گئی، جھیل وُلر کو جانے والے ہاؤس بوٹ، پل کی سنگلاخی محرابوں کے بیچ میں سے گزر گئے اور اب وہ افق کی لکیر پر کاغذ کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے بس نظر آ رہے تھے۔ شام کا قرمزی رنگ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلتا گیا اور قرمزی سے سرمئی اور سرمئی سے سیاہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ بادام کے پیڑوں کی قطار کی اوٹ میں پگڈنڈی بھی سو گئی اور پھر رات کے سناٹے میں پہلا تارا کسی مسافر کے گیت کی طرح چمک اٹھا۔ ہوا کی خنکی تیز تر ہوتی گئی اور نتھنے اس کے

بر فیلے لمس سے سُن ہو گئے۔

اور پھر چاند نکل آیا۔

اور پھر وہ آ گئی۔

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی، بلکہ پگڈنڈی کے ڈھلان پر دوڑتی ہوئی وہ میرے قریب آ کے رک گئی، اس نے آہستہ سے کہا:

'ہائے!'

اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی، پھر رک جاتی، پھر تیزی سے چلنے لگتی۔ اس نے میرے شانے کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پھر اپنا سر وہاں رکھ دیا اور اس کے گہرے سیاہ بالوں کا پریشان گھنا جنگل دور تک میری روح کے اندر پھیلتا چلا گیا اور میں نے اس سے کہا:

'سہ پہر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'

اس نے ہنس کر کہا: 'اب رات ہو گئی ہے، بڑی اچھی رات ہے یہ۔' اس نے اپنا کمزور ننھا چھوٹا سا ہاتھ میرے دوسرے شانے پر رکھ دیا اور جیسے بادام کے پھولوں سے بھری شاخ جھک کر میرے کندھے پر سو رہی۔

دیر تک وہ خاموش رہی۔ دیر تک میں خاموش رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنسی، بولی: 'ابا میرے پگڈنڈی کے موڑ تک میرے ساتھ آئے تھے، کیونکہ میں نے کہا، مجھے ڈر لگتا ہے۔ آج مجھے اپنی سہیلی رجو کے گھر سونا ہے، سونا نہیں ہے، جاگنا ہے۔ کیونکہ بادام کے پہلے شگوفوں کی خوشی میں ہم سب سہیلیاں رات بھر جاگیں گی اور گیت گائیں گی اور میں تو سہ پہر سے تیاری کر رہی تھی ادھر آنے کی۔ لیکن دھان صاف کرنا تھا اور کپڑوں کا یہ جوڑا کل دھویا تھا آج سوکھا نہ تھا۔ اسے آگ پر سکھایا اور اماں جنگل سے لکڑیاں چننے گئی تھیں وہ ابھی آئی نہ تھیں۔ اور جب تک وہ نہ آتیں میں مکئی کے بھٹے اور خشک خوبانیاں اور زردالو تمہارے لیے کیسے لا سکتی ہوں۔ دیکھو یہ سب کچھ لائی ہوں تمہارے لیے۔ ہائے تم تو سچ مچ خفا کھڑے ہو۔ میری طرف دیکھو میں آ گئی ہوں، آج پورے چاند کی رات ہے — آؤ کنارے لگی ہوئی کشتی کھولیں اور جھیل کی سیر کریں۔'

اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اور میں نے اس کی محبت اور حیرت میں گم پتلیوں کو دیکھا، جن میں اس وقت چاند چمک رہا تھا اور یہ چاند مجھ سے کہہ رہا تھا: جاؤ کشتی کھول کے جھیل کے پانی پر سیر کرو۔ آج بادام کے پہلے

شگوفوں کا مسرت بھرا تیوہار ہے۔ آج اُس نے تمہارے لیے اپنی سہیلیوں اپنے ابا، اپنی ننھی بہن اپنے بڑے بھائی سب کو فریب میں رکھا ہے، کیونکہ آج پورے چاند کی رات ہے اور بادام کے سپید خنک شگوفے برف کے گالوں کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کشمیر کے گیت اس کی چھاتیوں میں بچّے کے دودھ کی طرح امنڈ آئے ہیں۔ اُس کی گردن میں تم نے موتیوں کی یہ ست لڑی دیکھی۔ یہ سُرخ ست لڑی اس کے گلے میں ڈال دی اور اس سے کہا: "تو آج رات بھر جاگے گی۔ آج کشمیر کی بہار کی پہلی رات ہے۔ آج تیرے گلے سے کشمیر کے گیت یوں کھلیں گے، جیسے چاندنی رات میں زعفران کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ سُرخ ست لڑیاں پہن لے۔"

چاند نے یہ سب کچھ اس کی حیران پتلیوں سے جھانک کے دیکھا پھر یکا یک کہیں کسی پیڑ پر ایک بلبل نغمہ سرا ہو اٹھی اور کشتیوں میں چراغ جھلملانے لگے اور شکوں کے پرے بستی میں گیتوں کی مدھم صدا بلند ہوئی۔ گیت اور بچّوں کے قہقہے اور مردوں کی بھاری آوازیں اور ننھے بچّوں کے رونے کی میٹھی صدائیں چھتوں سے اور زندگی کا آہستہ آہستہ سلگتا ہوا دھواں۔ اور شام کے کھانے کی مہک، مچھلی اور بھات اور کڑم کے ساگ کا نرم نمکین اور لطیف ذائقہ اور پورے چاند کی رات کا بہار آفریں جوبن۔ میرا غصّہ ڈھل گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے کہا: "آؤ چلیں جھیل پر۔"

پل گزر گیا۔ پگڈنڈی گزر گئی۔ بادام کے درختوں کی قطار ختم ہوگئی۔ اب ہم جھیل کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ جھاڑیوں میں مینڈک بول رہے تھے۔ مینڈک اور جھینگر اور مینڈے، ان کی بے ہنگم صداؤں کا شور بھی ایک نغمہ بن گیا تھا۔ ایک خواب ناک ہمنفی اور سوئی ہوئی جھیل کے بیچ میں چاند کی کشتی کھڑی تھی۔ ساکن چپ چاپ، محبت کے انتظار میں، ہزاروں سال سے اسی طرح کھڑی تھی۔ میری اور اس کی محبت کی منتظر، تمھاری اور تمھارے محبوب کی مسکراہٹ کی منتظر، انسان کے انسان کو چاہنے کی آرزو کی منتظر، یہ پورے چاند کی حسین پاکیزہ رات محبت کے مقدس لمس کی منتظر ہے۔

کشتی خوبانی کے ایک پیڑ سے بندھی تھی۔ جو بالکل جھیل کے کنارے اُگا تھا۔ یہاں پر زمین بہت نرم تھی اور چاندنی کی اوٹ سے چھنتی ہوئی آرہی تھی اور مینڈک ہولے ہولے گا رہے تھے اور جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چومتا جاتا تھا اور اس کے چومنے کی صدا بار بار ہمارے کانوں میں آرہی تھی...... جھیل کی سطح پر لاکھوں کنول کھل گئے۔ نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکا یک بلند ہو کے صدہا گیت گانے لگے اور لاکھوں مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں میں

دعاؤں کا شور بلند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں میں اڑنے والے بادل سب مل کر ناچنے لگے۔ پھر کنول کھلتے کھلتے سمٹتے گئے کلیوں کی طرح۔ اور گیت بلند ہو ہو کے مدھم ہوتے گئے اور ناچ دھیما پڑتا پڑتا رک گیا۔ اب وہی مینڈک کی آواز تھی۔ وہی جھیل کے نرم نرم بوسے۔

میں نے آہستہ سے کشتی کھولی۔ وہ کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں نے چپو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کشتی کو کھے کر جھیل کے مرکز میں لے گیا۔ یہاں کشتی آپ ہی آپ کھڑی ہوگئی۔ نہ اِدھر بہتی تھی اور نہ اُدھر۔ میں نے چپو اُٹھا کر کشتی میں رکھ لیا۔ اس نے پوٹلی کھولی، اس میں سے زردالو نکال کے مجھے دیے۔ خود بھی کھانے لگی۔

زردالو خشک تھے اور کھٹے میٹھے۔

وہ بولی یہ پچھلی بہار کے ہیں۔

میں زردالو کھاتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ آہستہ سے بولی:

'پچھلی بہار میں تم نہ تھے۔'

پچھلی بہار میں میں نہ تھا۔ اور زردالو کے پیڑ پھولوں سے بھر گئے تھے۔ اور ذرا سی شاخ ہلانے پر پھول ٹوٹ کر سطحِ زمین پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے تھے۔ پچھلی بہار میں میں نہ تھا اور زردالو کے پیڑ پھلوں سے لدے پھندے تھے۔ سبز سبز زردالو۔ سخت کھٹے زردالو جو نمک مرچ لگا کے کھائے جاتے تھے اور زبان سی سی کرتی تھی اور ناک بہنے لگتی تھی۔

زردالو کھا کے ہم نے خشک خوبانیاں کھائیں۔ خوبانی پہلے تو بہت میٹھی معلوم نہ ہوتی مگر جب دہن کے لعاب میں گھل جاتی تو شہد و شکر کا مزہ دینے لگتی۔

'نرم نرم بہت میٹھی ہیں یہ' میں نے کہا۔

اس نے ایک گٹھلی کو دانتوں سے توڑا اور خوبانی کا بیج نکال کر مجھے دیا: 'کھاؤ، بادام کی طرح میٹھا ہے۔'

'ایسی خوبانیاں میں نے کبھی نہیں کھائیں۔'

اس نے کہا: 'یہ ہمارے آنگن کا پیڑ ہے۔ ہمارے یہاں خوبانی کا ایک ہی پیڑ ہے۔ مگر اتنی بڑی سُرخ اور میٹھی خوبانیاں ہوتی ہیں اس کی کہ میں کیا کہوں۔ جب خوبانیاں پک جاتی ہیں تو میری سہیلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اور خوبانیاں کھلانے کو کہتی ہیں ...... پچھلی بہار میں......'

اور میں نے سوچا، پچھلی بہار میں میں نہ تھا، مگر خوبانی کا پیڑ آنگن میں اسی طرح کھڑا تھا، پچھلی بہار میں وہ نازک پتوں سے بھر گیا تھا۔ پھر ان میں کچی خوبانیوں کے سبز اور نکیلے پھل لگے تھے۔ ابھی ان خوبانیوں میں گٹھلی پیدا ہوئی تھی اور یہ کچے کھٹے پھل دوپہر کے کھانے کے ساتھ چٹنی کا کام دیتے تھے۔ پچھلی بہار میں میں نہ تھا اور ان خوبانیوں میں گٹھلیاں پیدا ہوگئی تھیں اور خوبانیوں کا رنگ ہلکا سنہرا ہونے لگا تھا۔ اور گٹھلیوں کے اندر نرم نرم بیج اپنے ذائقے میں سبز باداموں کو بھی مات کرتے تھے۔

خوبانیاں کھا کے اس نے مکی کا بھٹا نکالا۔ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ سنہرا سینکا ہوا بھٹا۔ اور کرکرے دانے صاف شفاف موتیوں کی سی چلا لیے ہوئے اور ذائقے میں بے حد شیریں۔

وہ بولی: 'یہ مصری مکی کے بھٹے ہیں۔'

'بے حد میٹھے۔' میں نے بھٹا کھاتے ہوئے کہا۔

وہ بولی: 'پچھلی فصل کے رکھے تھے، گھڑوں میں چھپا کے۔ اماں کی آنکھ سے اوجھل۔'

میں نے بھٹا ایک جگہ سے کھایا۔ دانوں کی چند قطاریں رہنے دیں، پھر اس نے اسی جگہ سے کھایا اور دانوں کی چند قطاریں میرے لیے رہنے دیں۔ جنھیں میں کھانے لگا اور اس طرح ہم دونوں ایک ہی بھٹے سے کھاتے گئے۔ اور میں نے سوچا: یہ مصری مکی کے بھٹے کتنے میٹھے ہیں۔ یہ پچھلی فصل کے بھٹے، جب تو تھی میں نہ تھا۔ جب تیرے باپ نے ہل چلایا تھا کھیتوں میں۔ گوڑی کی تھی، بیج بوئے تھے، بادلوں نے پانی دیا تھا۔ زمین نے سبز سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پودے اُگائے تھے، جن میں تو نے نلائی کی تھی۔ پھر پودے بڑے ہوگئے تھے اور ہوا میں جھومنے لگے تھے اور تو مکی کے پودوں پر ہرے ہرے بھٹے دیکھنے جاتی تھی۔ جب میں نہ تھا۔ لیکن بھٹوں کے اندر دانے پیدا ہو رہے تھے، دودھ بھرے دانے، جن کی نازک جلد کے اوپر اگر ذرا سا بھی ناخن لگ جائے تو دودھ باہر نکل آتا ہے۔ ایسے نرم و نازک بھٹے اس دھرتی نے اُگائے تھے اور میں نہ تھا۔ دھرتی تھی، تخلیق تھی، محبت کے گیت تھے۔ آگ پر سینکے ہوئے بھٹے تھے، لیکن میں نہ تھا۔

میں نے مسرّت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا: 'آج پورے چاند کی رات کو جیسے ہر بات پوری ہوگئی ہے۔'

اس نے بھٹا میرے منہ سے لگا دیا۔ اس کے ہونٹوں کا گرم گرم نمناک لمس ابھی تک اس بھٹے پر تھا۔

وہ پورے چاند کی رات مجھے اب تک نہیں بھولتی۔ میری عمر ستر برس کے قریب ہے، لیکن وہ پورے چاند کی

رات میرے ذہن میں اس طرح چمک رہی ہے جیسے ابھی وہ کل آئی تھی۔ ایسی پاکیزہ محبت میں نے آج تک نہیں کی ہوگی، اس نے بھی نہیں کی ہوگی، وہ جادو ہی کچھ اور تھا جس نے پورے چاند کی رات کو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے یوں ملا دیا کہ وہ پھر گھر نہیں گئی۔ اور ہم محبت میں کھوئے ہوئے بچوں کی طرح اِدھر اُدھر جنگلوں کے کنارے ندی نالوں پر اخروٹوں کے سائے تلے گھومتے رہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ پھر میں نے اسی جھیل کے کنارے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا اور اس میں ہم دونوں رہنے لگے۔ کوئی ایک مہینے کے بعد میں سری نگر گیا اور اس سے یہ کہہ کے گیا کہ تیسرے دن لوٹ آؤں گا، تیسرے دن میں لوٹ آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک نوجوان سے گھل مل کے باتیں کر رہی ہے۔ وہ دونوں ایک ہی رکابی میں کھانا کھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں۔ میں نے انہیں دیکھ لیا لیکن انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی مسرت میں اس قدر محو تھے کہ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور میں نے سوچا کہ یہ پچھلی بہار یا اس سے بھی پچھلی بہار کا محبوب ہے، جب میں نہ تھا۔ اور پھر شاید اور آگے بھی کتنی ہی ایسی بہاریں آئیں گی، کتنی ہی پورے چاند کی راتیں، جب محبت ایک فاحشہ عورت کی طرح بے قابو ہو جائے گی اور عریاں ہو کے رقص کرنے لگے گی۔ آج تیرے گھر میں خزاں آگئی ہے جیسے بہار کے بعد آتی ہے۔ اب تیرا یہاں کیا کام۔ اس لیے میں یہ سوچ کر ان سے ملے بغیر، اسی طرح واپس چلا گیا اور پھر اپنی پہلی بہار سے کبھی نہیں ملا۔

اور اب میں اڑتالیس برس کے بعد لوٹ کے آیا ہوں۔ میرے بیٹے میرے ساتھ ہیں۔ میری بیوی مر چکی ہے لیکن میرے بیٹوں کی بیویاں اور ان کے بچے میرے ساتھ ہیں اور ہم لوگ سیر کرتے کرتے سُمل جھیل کے کنارے آنکلے ہیں اور اپریل کا مہینہ ہے۔ سہ پہر سے شام ہوگئی ہے اور میں دیر تک پُل کے کنارے کھڑا بادام کے پیڑوں کی قطاریں دیکھتا جاتا ہوں اور خنک ہوا میں سفید گوشوں کے گچھے لہراتے جاتے ہیں اور پگڈنڈی کی خاک پر سے کسی جانے پہچانے قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک حسین دوشیزہ لڑکی ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی دبائے پُل پر سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہے اور میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ دور پار ٹیکروں سے پرے بستی میں کوئی بیوی اپنے خاوند کو آواز دے رہی ہے، وہ اسے کھانے پر بلا رہی ہے۔ کہیں سے ایک دروازہ بند ہونے کی صدا آتی ہے اور ایک روتا ہوا بچہ یکا یک چپ ہو جاتا ہے۔ چھتوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پرندے شور مچاتے ہوئے ایک دم درختوں کی گھنی شاخوں میں اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور پھر ایک دم چپ ہو جاتے ہیں۔ ضرور کوئی مانجھی گا رہا

ہے اور اس کی آواز گونجتی گونجتی افق کے اُس پار گم ہوتی جا رہی ہے۔

میں پُل کو پار کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ میرے بیٹے اور ان کی بیویاں اور بچّے میرے پیچھے آ رہے ہیں، الگ الگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہاں پر بادام کے پیڑوں کی قطار ختم ہو گئی، تالہ بھی ختم ہو گیا۔ جھیل کا کنارہ ہے۔ یہ خوبانی کا درخت ہے، لیکن کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ مگر کشتی، یہ کشتی ہے مگر کیا یہ وہی کشتی ہے۔ سامنے وہ گھر ہے۔ میری پہلی بہار کا گھر، میری پورے چاند کی رات کی محبت۔

گھر میں روشنی ہے بچّوں کی صدائیں ہیں۔ کوئی بھاری آواز میں گانے لگتا ہے۔ کوئی بڑھیا اسے چیخ کر چپ کر دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، آدھی صدی ہو گئی۔ میں نے اس گھر کو نہیں دیکھا۔ دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ میں گھر کے اندر چلا جاتا ہوں۔

بڑے اچھے پیارے بچّے ہیں۔ ایک جوان عورت اپنے خاوند کے لیے رکابی میں کھانا رکھ رہی ہے، مجھے دیکھ کر ٹھٹھک جاتی ہے۔ دو بچّے لڑ رہے تھے، مجھے دیکھ کر حیرت سے چپ ہو جاتے ہیں۔ بُڑھیا جو ابھی غصّے میں ڈانٹ رہی تھی، تھم کے پاس آ کے کھڑی ہو جاتی ہے، کہتی ہے: 'کون ہو تم؟'

میں نے کہا: 'یہ میرا گھر ہے۔'

وہ بولی: 'تمھارے باپ کا ہے۔'

میں نے کہا: 'میرے باپ کا نہیں ہے، میرا ہے۔ کوئی اڑتالیس برس ہوئے، میں نے اسے خریدا تھا۔ بس اس وقت تو یونہی میں اسے دیکھنے کے لیے چلا آیا۔ آپ لوگوں کو نکالنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ یہ گھر تو بس جیسے اب آپ ہی کا ہے۔ میں تو یونہی......' میں یہ کہہ کر لوٹنے لگا۔ بڑھیا کی انگلیاں سختی سے تھم پر جم گئیں۔ اس نے سانس زور سے اندر کو کھینچی۔ بولی: 'تو تم ہو...... اب اتنے برس کے بعد کوئی کیسے پہچانے......'

وہ تھم سے لگی دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ میں نیچے آنگن میں چپ چاپ کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنس دی، بولی: 'آؤ میں تمھیں اپنے گھر کے لوگوں سے ملاؤں...... دیکھو، یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ یہ اس سے چھوٹا ہے، یہ بڑے بیٹے کی بیوی ہے۔ یہ میرا بڑا پوتا ہے، سلام کرو بیٹا۔ یہ پوتی...... یہ میرا خاوند ہے۔ شش اسے جگاؤ نہیں۔ پرسوں سے اسے بخار آ رہا ہے۔ سونے دو اسے......'

وہ بولی: 'تمھاری کیا خاطر کروں۔'

میں نے دیوار پر کھونٹی سے ٹنگے ہوئے مکّی کے بھٹوں کو دیکھا، سینکے ہوئے بھٹے سنہرے موتیوں کے سے
شفاف دانے۔

ہم دونوں مسکرا دیے۔

وہ بولی: 'میرے تو بہت سے دانت جھڑ چکے ہیں، جو ہیں بھی وہ کام نہیں کرتے۔'

میں نے کہا: 'یہی حال میرا بھی ہے۔ بھٹا نہ کھا سکوں گا۔'

مجھے گھر کے اندر گھستے دیکھ کر میرے گھر کے افراد بھی اندر چلے آئے تھے۔ اب خوب گہما گہمی تھی۔ بچّے ایک
دوسرے سے بہت جلد گھل مل گئے۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ باہر چلے آئے۔ آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے چلے گئے۔

وہ بولی: 'میں نے چھے برس تمھارا انتظار کیا۔ تم اس روز کیوں نہیں آئے؟'

میں نے کہا: 'میں آیا تھا، مگر تمھیں کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔'

'کیا کہتے ہو؟' وہ بولی۔

'ہاں تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں، ایک ہی رکابی میں اور وہ تمھارے منہ میں اور تم اس کے منہ میں لقمے
ڈال رہی تھیں۔'

وہ اک دم چپ ہوگئی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

'کیا ہوا؟' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ بولی: 'ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا۔'

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ 'وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اسی روز تم بھی آنے والے تھے۔ وہ واپس
جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا کہ تم سے مل کے جائے۔ تم پھر آئے ہی نہیں۔'

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ چھے برس میں نے تمھارا انتظار کیا۔ مگر تم نہیں آئے۔ پھر میں نے شادی کر لی۔

دو بچے باہر نکل آئے۔ کھیلتے کھیلتے ایک بچّہ دوسری بچّی کو مکّی کا بھٹا کھلا رہا تھا۔

اس نے کہا: 'وہ میرا پوتا ہے۔'

میں نے کہا: 'وہ میری پوتی ہے۔'

وہ دونوں بھاگتے بھاگتے جھیل کے کنارے کنارے دور تک چلے گئے۔ زندگی کے دو خوبصورت مُرقّعے۔ ہم دیر تک انہیں دیکھتے رہے۔ وہ میرے قریب آگئی۔ بولی: 'آج تم آئے ہوتو مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے اب اپنی زندگی بنالی ہے۔ اس کی ساری خوشیاں اور غم دیکھے ہیں۔ میرا ابھرا بھرا گھر ہے۔ اور آج تم بھی آئے ہو، مجھے ذرا بھی بُرا نہیں لگ رہا ہے۔'

میں نے کہا: 'یہی حال میرا ہے۔ سوچتا تھا زندگی بھر تم سے نہیں ملوں گا۔ اسی لیے اتنے برس اِدھر کبھی نہیں آیا۔ اب آیا ہوں تو رتی بھر بھی بُرا نہیں لگ رہا۔'

ہم دونوں چپ ہوگئے۔ بچّے کھیلتے کھیلتے ہمارے پاس واپس آگئے۔ اس نے میری پوتی کو اٹھالیا، میں نے اس کے پوتے کو، اس نے میری پوتی کو چوما، میں نے اس کے پوتے کو، اور ہم دونوں خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وہ چاند حیرت اور مسرت سے کہہ رہا تھا 'انسان مرجاتے ہیں لیکن زندگی نہیں مرتی، بہار ختم ہوجاتی ہے لیکن پھر دوسری بہار آجاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہوجاتی ہیں لیکن زندگی کی بڑی عظیم سچّی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے، وہ بہار میں نے دیکھی، اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہوگے، لیکن زندگی بھی ہوگی اور محبت بھی ہوگی اور خوب صورتی اور رعنائی اور معصومیت بھی......

بچّے ہماری گود سے اتر پڑے کیونکہ وہ الگ سے کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے خوبانی کے درخت کے قریب چلے گئے، جہاں کشتی بندھی تھی۔

میں نے پوچھا: 'یہ وہی درخت ہے۔'

اس نے مسکرا کر کہا: 'نہیں یہ دوسرا درخت ہے۔'

لفظ و معنی

خنکی	۔	سردی، ٹھنڈک
لطافت	۔	نرمی، نزاکت، عمدگی
دوب	۔	گھاس
تنگ	۔	پہاڑ کی چوٹی، بلندی
کُہرا	۔	دھند، کُہر، وہ بخارات جو سردی کے موسم میں صبح اور رات کو دھند پیدا کردیتے ہیں۔

سطح ۔ کسی چیز کا بالائی حصہ

زمستان ۔ جاڑا، سردی کا موسم

گوت ۔ خاندان، گھرانہ، حسب نسب، گوتر بھی استعمال ہوتا ہے۔

بے لوث ۔ بے غرض

شکارا ۔ ایک خاص قسم کی کشتی جو کشمیر کی جھیلوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

رقص ۔ ناچ، رقصاں بہ معنی ناچتا ہوا

لرزنا ۔ کانپنا، لرزاں بہ معنی کانپتا ہوا

سنگلاخ ۔ پتھریلی زمین یا پہاڑی علاقہ سنگلاخی کنایتاً مشکل، دشوار

افق ۔ آسمان کا کنارا۔ جمع آفاق

شانہ ۔ کاندھا، مونڈھا، ایک معنی کنگھی بھی ہوتا ہے۔

مسرت ۔ خوشی، شادمانی، انبساط

گوڑی کرنا ۔ کھرپی سے پودوں کے چاروں طرف کی مٹی کو نیچے اوپر کرنا، گوڑنا اسی کو گوڑنا بھی کہتے ہیں۔

نلائی کرنا ۔ کھیت میں سے گھاس پھوس صاف کرنا۔

خوبانی ۔ زردآلو، ایک قسم کا پھل

لمس ۔ کسی چیز کو چھونے کا احساس، مس کرنا

قرمزی ۔ لال، سُرخ رنگ، قرمز بیر بہوٹی کی مانند ایک کیڑا

شگوفہ ۔ کلی، بن کھلا پھول، شگوفہ چھوڑنا ایک محاورہ ہے، مراد انوکھی بات

بے لوث ۔ بے غرض، بغیر کسی فائدے کے کوئی کام کرنا۔

مرکز ۔ بیچ، درمیان

دہن ۔ منہ

مرقع ۔ تصویروں کی کتاب، البم

مات دینا ۔ شکست دینا

کھلیان ۔ کھیت میں اناج رکھنے کی جگہ

عظیم - بڑا، کلاں

تھم - کھمبا، کیلے کے پیڑ کا تنا

آپ نے پڑھا

- یہ افسانہ کشمیر کی حسین و رنگین سرزمین کی ایک خوب صورت داستان ہے۔ اس افسانے میں بہاروں کی سرزمین کشمیر کی حسین وادیوں، پہاڑوں اور جھیلوں کا ذکر ہے۔ پھولوں، حسین پودوں اور خوبانی کے درختوں کے علاوہ ہری بھری خوش نما گھاس اور برف سے ڈھکی پہاڑوں کی چوٹیوں کی منظر نگاری ہے، ساتھ ہی دو معصوم دلوں کی درد بھری ایک داستان بھی ہے۔
- اس افسانے کو بیان کرنے والا ایک بوڑھا شخص ہے جو کبھی ایک لڑکی سے بہت پیار کرتا تھا، لڑکی بھی اس کو بہت چاہتی تھی۔ لیکن ایک غلط فہمی کی بنیاد پر دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں اور پھر 48 برس کے بعد ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے، جب وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو پہلی نظر میں ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں پاتے ہیں، اس لیے کہ دونوں ہی بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ لڑکا دادا بن چکا تھا اور کہانی کی لڑکی بھی اپنے ناتی پوتوں کو کھلا رہی تھی۔
- بوڑھی عورت جب اپنے ماضی کے خوابوں کے شہزادہ بوڑھے مرد کو پہچان جاتی ہے تو اس سے اپنی درد بھری آواز میں یہ کہتی ہے: 'اب اتنے برس کے بعد آئے ہو تو کوئی کیسے پہچانے؟ میں نے چھ برس تمھارا انتظار کیا تم کیوں نہیں آئے؟'

بوڑھا مرد جواب دیتا ہے: 'میں آیا تھا مگر تمھیں ایک دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا، اس روز تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں، ایک ہی رکابی میں۔'

بوڑھی عورت ایک دم چپ ہو جاتی ہے اور پھر زور زور سے ہنسنے لگتی ہے، پھر کہتی ہے: 'ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا۔'

- کرشن چندر نے اس افسانے میں قدرتی مناظر کو بہت خوب صورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ الفاظ بھی بہت سادہ اور عام فہم استعمال کیے گئے ہیں۔
- افسانے کے آخر میں خوبانی کا دوسرا درخت ایک علامت کے طور پر دکھایا گیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زندگی اور محبت دونوں میں ایک تسلسل ہے، ایک روانی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ایک چیز اگر جاتی ہے تو کوئی دوسری چیز فوراً اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

آپ بتائیے

1. کہانی بیان کرنے والے شخص کی ملاقات، لڑکی سے جب ہوئی تو وہ انگریزی سال کا کون سا مہینہ تھا؟
2. لڑکی لڑکے کے لیے کھانے کی کیا کیا چیزیں لائی تھی؟
3. خوبانیاں کھانے کے بعد لڑکے اور لڑکی نے اور کیا کھایا تھا؟
4. لڑکی کے ساتھ ایک ہی رکابی میں کھانے والا لڑکا رشتے میں لڑکی کا کیا لگتا تھا؟
5. کہانی بیان کرنے والا لڑکا جب اچانک غائب ہوجاتا ہے تو لڑکی نے کتنے سالوں تک انتظار کرنے کے بعد اپنی شادی کی تھی؟

مختصر گفتگو

1. پُل کے کنارے کنارے کس پھل کے پیڑ تھے؟

(الف) خوبانی (ب) اخروٹ (ج) بادام

2. لڑکی جب لڑکے سے ملنے آرہی تھی تو اس کے والد اسے چھوڑنے کہاں تک آئے تھے؟

(الف) جھیل تک (ب) سڑک تک (ج) پگڈنڈی تک

3. لڑکی کے گھر کے آنگن میں کس پھل کا پیڑ تھا؟

(الف) انار کا (ب) خوبانی کا (ج) سیب کا

4. لڑکی اور لڑکے نے مل کر ساتھ ساتھ کتنے بھٹے کھائے تھے؟

(الف) ایک (ب) تین (ج) دو

5. لڑکا 48 سال کے بعد جب لڑکی سے ملنے گھر میں داخل ہوتا ہے تو ایک جوان عورت اپنے خاوند کو کھانا دے رہی تھی، وہ جوان عورت لڑکی کی کون تھی؟

(الف) ماں (ب) بہو (ج) بہن

تفصیلی گفتگو

1. کرشن چندر نے تقریباً کتنی کتابیں لکھیں؟ ان کے پہلے ناول کا کیا نام ہے؟ ان کے چند دوسرے مشہور ناولوں کے نام بھی تحریر کریں۔

2. کرشن چندر نے وکالت کا امتحان کس سن میں پاس کیا تھا؟ اور کس یونی ورسٹی سے؟
3. اپنی ملازمت کے سلسلے میں وہ کن شہروں میں مقیم ہوئے؟
4. کرشن چندر کو حکومت ہند کی جانب سے کس اعزاز سے نوازا گیا تھا اور کیوں؟
5. کرشن چندر کے والد کا نام کیا تھا؟ ان کی وفات کس شہر میں ہوئی اور کب؟
6. جب کرشن چندر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازمت کر رہے تھے تو ان کو فلم میں کام کرنے کے لیے کس فلم کمپنی نے دعوت دی تھی اور وہ لکھنؤ سے کہاں چلے گئے تھے؟

آیئے، کچھ کریں

1. اردو زبان قومی ایکتا کی ایک خوب صورت علامت ہے، اس کے فروغ میں غیر مسلموں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ چند غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے نام تحریر کریں۔
2. کرشن چندر کے کچھ اور افسانوں کا مطالعہ کیجیے اور اپنے دوستوں کے ساتھ ان پر تبادلۂ خیال کیجیے۔

شکیلہ اختر

اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا کہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر سب سے ممتاز اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ وں نے برصغیر ہندوپاک میں اپنی ایک شناخت قائم کی اور ریاست کی دوسری خواتین افسانہ نگارں کو بھی ایک حوصلہ عطا کیا۔ شکیلہ ز نے باضابطہ طور پر افسانہ نگاری سے پہلے ادب لطیف جیسے نثر پارے تحریر کیے اور شاعری بھی کی۔ لیکن ان کا میلان طبع افسانہ نگاری طرف زیادہ تھا۔ لہذا اس میدان میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں اور لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

شکیلہ اختر کی کہانیوں میں عام طور پر متوسط مسلم گھرانے کا ماحول ملتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات وکوائف کو بہت سلیقے ر قرینے سے پیش کرنے کا ہنر جانتی تھیں۔ ان کے یہاں غایت درجے کی دروں بینی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گہری داخلیت کی یادوں پر ان کے متعدد افسانے اردو کی دوسری معروف افسانہ نگاروں سے ممتاز تر ہیں۔ شکیلہ اختر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ت کے کرب کو وسعت دے کر ہمہ گیر بنا دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھیں۔

شکیلہ اختر گیا ضلع کے ارول گاؤں میں 16 اگست 1916 کو پیدا ہوئیں۔ بعد میں ارول جہان آباد ضلع کا حصہ ہوگیا اور اس ت ارول کو خود ضلع کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ سون ندی کے ساحل پر بسا ہوا ارول ایک خوب صورت اور مشہور قصبہ ہے۔ یہاں شاہ رتوحید صاحب کا گھرانہ معزز اور ذی ثروت گھرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاہ محمد توحید صاحب شکیلہ اختر کے والد تھے۔

شکیلہ اختر کا پہلا افسانہ 'رحمت' ہے جو 1936 میں 'ادب لطیف' میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کے ۶ مجموعے شائع ہو چکے ں۔ درپن، آنکھ مچولی، ڈائن، آگ اور پتھر، لہو کے مول، آخری سلام۔ انہوں نے 'تنکے کا سہارا' کے نام سے ایک ناولٹ بھی تحریر کیا۔ کیلہ اختر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنے تمام افسانوں میں انہوں نے افسانے کے روایتی انداز کو قائم رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں ماجرا ازی، کردار نگاری اور بھرپور فضا آفرینی ہر جگہ ملتی ہے۔ عورتوں کی نفسیات پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

شکیلہ اختر نے تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی اور باضابطہ طور پر کبھی اسکول اور کالج میں نہیں پڑھا۔ ان کو ادبی خدمات کے لیے ختلف ریاستوں کی اردو اکادمیوں نے اعزازات وانعامات سے نوازا۔ آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی مشاورتی کمیٹی اور بہار اردو اکادمی کی جلس عاملہ کی ممبر بھی رہیں۔ 10 فروری 1994 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

شاید

ستمبر کا مہینہ تھا۔ بارش نہایت زور شور سے ہو رہی تھی۔ لوگوں کی نظریں حسرت سے کبھی آسمان کی طرف اٹھتیں اور کبھی زمین کی طرف۔ مگر سوائے پانی کے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ 13/ستمبر کو اتنی بارش ہوئی کہ اس کے خیال سے اب بھی دل کانپ جاتا ہے۔ کچی سڑکوں کا کیا پوچھنا۔ پختہ سڑکوں کا میلوں تک پتہ نہ چلتا تھا۔ اور ڈاک کی آمد و رفت تو مدت ہوئی بند ہو چکی تھی ہر طرف سے مکانوں کے گرنے کی ہیبت ناک صدائیں بلند ہو رہی تھیں بارش کے ساتھ ہی یہ غضب ہو گیا کہ دریا نے بھی بڑے زور شور سے بڑھنا شروع کر دیا۔ اور 13/ستمبر کی رات غضب ناک شیرنی کی طرح پھلگو ندی اُبل پڑی۔ غریبوں کی جھونپڑیوں کا کیا کہنا بڑی بڑی کوٹھیوں کی مستحکم بنیادیں ڈگمگانے لگیں۔ ایسی بارش اور ایسی طغیانی تھی کہ ریلوے لائن بھی اس کی متحمل نہ ہو سکی۔ آخر خدا خدا کر کے پانی تھ مگر کب؟ جب سینکڑوں مکانات پیوند زمیں ہو چکے تھے۔ آبادیاں ویرانوں میں منتقل ہو چکی تھیں اور جب خوش حال گھرانے مٹھی بھر چاول اور چنے کی طرف بھوکے کتوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

اب بارش ختم ہو چکی تھی اور ندی بھی تھم گئی تھی۔ (مصیبت زدہ غریبوں کے سوا دنیا پھر اپنی جگہ پر بدستور تھی شام کا وقت تھا۔ میں خطوط لکھنے میں بے طرح مشغول تھی کہ ایک آواز، ایک دل دوز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ..... بیٹی! ...... پانچ دن سے...... مسلسل پانچ روز سے ہم بھوکے ہیں۔ آہ! میرے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی پانچ د سے ایک ایک دانہ کے لیے تڑپ رہے ہیں۔'

میں نے گھبرا کر دیکھا تو میرے سامنے ہی ایک شریف صورت ادھیڑ عمر کی عورت میلی چادر میں لپٹی کھڑ تھی، میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ 'آپ کہاں سے آئی ہیں؟'

میرے اس سوال سے وہ پھوٹ پڑی اور بولی۔ 'میرا گھر؟ ...... آہ! اب کہاں ...... ! سب کچھ تو ہوا مگر! بچہ! میرا آٹھ سال کا پیارا بچہ وہ کہاں رہ گیا؟' اس نے اشک آلود نظروں سے مجھے دیوانہ وار گھورتے ہوئے کہا۔ ' میں سوفی کی رہنے والی ہوں۔ مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ سبھی کچھ میسر تھا۔ مگر اب کچھ بھی نہیں۔ ظالم طغیانی نے سے میرا سب کچھ چھین لیا! ...... میرا گھر! ...... میرا معصوم بچہ! میرا منور! ہائے اس کو مجھ سے کیوں لے لیا؟ منور!

بچہ! آہ! میرا لال.....‘

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ اور آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔

وہ کہنے لگی۔ ’ستمبر کی رات کو ہم لوگ اپنے گھر میں آرام سے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر اتنا بے چین نہ تھا جتنا آج ہے۔ میرے بچے ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ میری نئی بہو گھر کے انتظام میں لگی ہوئی تھی اور میں نماز پڑھ رہی تھی۔ سویرے ہی سنا تھا کہ پھلگو ندی بڑے زور سے بڑھ رہی ہے۔ میں نماز میں مشغول تھی۔ مگر بادل کی گرج سے دل دہل رہا تھا۔ دفعتاً بڑے زور کا ایک دھماکا ہوا اور میرے صحن کی دیوار چور چور ہو کر صحن کے پانی میں گھل مل گئی۔ میں نے نماز ختم کر کے جیسے ہی سلام پھیرا کہ میری نظر مکان میں رینگتے ہوئے پانی پر گئی۔ میں حیران تھی کہ یا اللہ یہ کیسا پانی ہے بارش کا یا ندی کا؟ پانی تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔ ہم اس میں بہنے لگے۔ اب ہم ایک دوسرے سے بے خبر بہتے ہوئے ایک نامعلوم اور لامحدود منزل کی طرف چلے جا رہے تھے!..... اس کے بعد میری بچی! مجھے کچھ خبر نہیں۔ نہ جانے کتنی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ اپنے گاؤں کے رئیس بنگالی بابو کے بنگلے میں پڑے ہیں۔ جیسے ہی میری آنکھیں کھلیں بے چین ہو ہو کر اپنے پیاروں کو ڈھونڈنے لگی۔ سب ہی تھے۔ مگر آہ! میرا منور میرا آٹھ سال کا پیارا بچہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ میں نے چیخ چیخ کر اپنے بچے کو آوازیں دیں دیوانہ وار ہر طرف ڈھونڈنے دوڑی۔ مگر منور! میرا پیارا بچہ نہ ملا۔‘

اتنا کہہ کر وہ پھر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ اس نے بولنے کی غرض سے منہ کھولا۔ مگر بھوک اور غم کی شدت سے اس کی آواز بہ مشکل نکل رہی تھی۔ ’میرا شوہر اور میرا لڑکا نوکری کے لیے رنگون گیا ہے۔ میری ایک سال کی بیاہی ہوئی بہو امید سے ہے۔ اور میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا نہ کوئی گھر ہے اور نہ در۔ آج اپنی بستی سے چلے ہوئے پانچ روز ہو گئے ہیں۔ اس دوران میں میرے بچوں کی غذا صرف وہی دو مٹھی چنے تھی۔ دو مٹھی چنے اور میرے تین بچے۔ پانچ روز کا سفر۔ میرے اللہ میرے بچے کیسے تڑپ رہے ہیں۔ کاش میرا منور ہوتا اور آج یہ غم دیکھنے کے لیے میں نہ ہوتی۔‘ وہ اتنا کہہ کر گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے لب کانپ رہے تھے اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’سفر کرتے ہوئے آج پانچ روز ہو گئے۔ اور ابھی ہماری منزل بہت دور ہے۔ میں پٹنہ باقر گنج اپنے میکے لٹی ہوئی جا رہی ہوں۔ وہاں جا کر اپنے بیٹے اور شوہر کو اپنی بربادی کی خبر بھیجوں گی۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ پٹنہ یہاں سے کتنی دور ہے؟‘

میں نے کہا۔ 'یہاں سے پٹنہ کافی دور ہے۔ قریب ۴۰ میل۔ مگر آپ اسٹیمر سے کیوں نہیں جاتیں۔ آج اس کے آنے کا بھی دن ہے۔' میری باتوں کو سن کر وہ تڑپ کر بولی۔ 'اسٹیمر سے جاؤں؟ مگر کرایہ کہاں سے لاؤں؟ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ اپنے بچّوں کا پیٹ بھر سکوں۔ ۴۰ میل میرے بچّے کیسے چل سکیں گے؟ یہاں تک تو آتے ہوئے ان کے نازک پیروں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی میں انہیں بہلا پھسلا کر لے ہی آئی۔ اب انہیں سفر پر کیسے آمادہ کروں۔ جب کہ بھوک کی شدت پر بھی وہ سفر کے اختتام کے خیال خام پر خوش ہو کر کھیل رہے ہیں۔' میں نے کچھ پیسے دے کر کہا۔ 'اپنے بچّوں کو راستہ میں کوئی چیز خرید کر دیجیے گا۔ اور یہ کھانا ہے۔ کھانا آپ خود کھا لیں۔' وہ ممنون نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ 'بیٹی کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ ایک ماں اپنے ننھے ننھے بچّوں کو بھوک میں تڑپتا چھوڑ کر پہلے اپنا پیٹ بھر سکتی ہے۔ تم ماں کی ممتا کو کیا جانو۔ آہ! یہ دل جو اپنے آٹھ سال کے بچّے کے غم میں ماتم کر رہا ہے۔ وہی دل آج تمھارے در پر اپنے دوسرے بچّوں کے واسطے بھیک لینے کے لیے مجھے گھسیٹتا ہوا بھی لایا ہے۔ لاؤ میں یہ کھانا پہلے اپنے بچّوں کو کھلاؤں گی اس کے بعد اگر کچھ بچ رہے گا تو میں بھی کھا لوں گی۔ دیکھو سردی کس بلا کی پڑ رہی ہے اور اس ٹھنڈک میں میرے بچّے درخت کے نیچے ٹھٹھرے ہوئے پڑے ہیں۔' میں نے اسے چادر دیتے ہوئے کہا۔ 'شاید یہ آپ کی کچھ مدد کر سکے۔' اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی اور مکان ہے، جہاں سے وہ کچھ اور مدد حاصل کر سکے۔ میں نے اپنی ملازمہ کے ساتھ اسے ایک مکان میں بھجوا دیا۔

جب وہ وہاں سے آئی تو معلوم ہوا کہ سوجے ہوئے پیروں اور اشک آلود آنکھوں کو دیکھ کر لوگوں نے قہقہے لگائے ہیں۔ اس نے اپنی دردناک کہانی مختصر پیرائے میں بیان کی۔ جسے سنتے ہی لوگ کہنے لگے۔ 'ہم نے یہ سب ڈھونگ بہت دیکھے ہیں۔ تم ایک کہنہ مشق فریبی ہو۔ کیونکہ واقعی تمہارے لب و لہجہ سے بہت کم آدمی تمھیں پہچان سکتے ہیں اور یہ آنسوؤں کی جھڑی تو تمھاری اچھی خاصی مددگار ہے۔ جاؤ وہاں جاؤ، جہاں آنسوؤں کے پردے معصوم عقلوں پر پڑ کر تمھارے فریب کو کارآمد بنا سکیں۔' اس نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'ہاں آج یہ وقت آیا کہ میں دوسروں کی محتاج ہوں۔ مگر مجھے آپ سے شکایت نہیں، گلہ ہے تو اس خدا سے جس نے دنیا کو فریبی بنا کر سچے حق داروں کے حقوق کیوں چھین لیے۔' اس کی یہ باتیں سن کر وہ اور زور سے ہنس پڑے۔ غریب عورت غمگین لہجے میں مجھ سے بولی۔ 'آہ! اب لوگ مجھے فریبی کہتے ہیں۔'

وہ جھکی اور میرے دیے ہوئے کھانے کو اٹھا کر لنگڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ شاید یہ ایک پُرفریب کھیل ہو۔

الفاظ و معنی

حسرت	۔	افسوس، کسی چیز کے نہ ملنے کا احساس، آرزو، شوق اور ارمان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
مستحکم	۔	مضبوط، پکا
دل دوز	۔	دل پر اثر کرنے والا
اشک	۔	آنسو
صحن	۔	آنگن
لامحدود	۔	جس کی کوئی حد مقرر نہ ہو
غذا	۔	خوراک، کھانا
خام	۔	کچا، کمزور
فریب	۔	دھوکا، دغا
گلہ	۔	شکوہ، شکایت

آپ نے پڑھا

- پھلگو ندی میں طغیانی، سیلاب اور اس کے نواحی علاقوں میں تیز اور مسلسل بارش کے سبب کئی گاؤں تباہ و برباد ہوجاتے ہیں، پوری کی پوری آبادی ویرانے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ مکانات منہدم ہوجاتے ہیں اور جھونپڑیوں کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ریلوے لائن کو بھی نقصان ہوتا ہے اور آمدورفت پوری طرح مفلوج ہوکر رہ جاتی ہے۔ ایسی طوفانی بارش اور تباہ کن سیلاب سے غریب لوگ تو متاثر ہوتے ہی ہیں امیروں کے گھر بھی محفوظ نہیں رہتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک شریف اور نیک عورت کی درد بھری داستان کو بہت خوب صورت اور پُراثر انداز میں افسانہ نگار نے پیش کیا ہے۔
- عورت طوفان اور سیلاب آنے سے قبل ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی اور اُسے کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ وہ اپنے خاندان اور بال بچوں کے ساتھ بہت خوش تھی کہ اچانک اس کی زندگی میں غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ طوفان اور سیلاب نے اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ سیلاب میں اس عورت کا ایک آٹھ سال کا بچہ جس کا نام منور تھا وہ بھی ڈوب کر مر گیا تھا۔ اس عورت کا شوہر اور ایک جوان بیٹا نوکری کرنے رنگون گیا ہوا تھا اور عورت ان لوگوں کے نہ رہنے کی وجہ

سے بالکل تنہا اور بے سہارا ہو گئی تھی۔

- وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں اور جوان بہو کو لے کر کسی طرح سے گاؤں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور پٹنہ جانا چاہتی ہے تاکہ وہاں پہنچ کر وہ اپنے شوہر اور بیٹے کو اپنی تباہی و بربادی کے بارے میں خط لکھ کر بتا سکے۔ لیکن پانچ روز تک پیدل چلنے کے بعد بھی وہ پٹنہ نہیں پہنچ پاتی ہے اور جب بھوک اور پیاس سے وہ نڈھال ہو جاتی ہے تو ایک مکان میں داخل ہو کر اپنی پُر درد کہانی ایک دوسری عورت کو سناتی ہے۔ وہ عورت جو مکان کی مالک تھی، نیک اور ہمدرد تھی وہ پریشان حال عورت کو کھانے کے لیے کھانا دیتی ہے اور کچھ پیسے بھی دیتی ہے۔
- عورت کھانا خود نہیں کھاتی بلکہ اپنے بھوکے بچوں کو کھلا دیتی ہے اور ان بچوں کے لیے ایک چادر بھی طلب کرتی ہے جو اسے مل جاتی ہے۔ تب وہ کہتی ہے کہ کیا کوئی اور مکان ہے جہاں سے وہ کچھ اور مدد حاصل کر سکے؟ نیک عورت جس نے اس کی مدد کی تھی اپنی ملازمہ کے ساتھ اسے ایک دوسرے مکان میں بھیج دیتی ہے جو پڑوس میں ہی تھا۔
- دوسرے مکان میں جانے کے بعد عورت کا درد اور بڑھ جاتا ہے اور ردد کی جگہ پر اس کے حصے میں صرف طعن و تشنیع آتے ہیں، اسے دغاباز اور فریبی کہا جاتا ہے جس سے عورت کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور اس کا درد سوا ہو جاتا ہے۔ وہ واپس آکر پہلی عورت کو جس نے اس کی ہر طرح سے مدد کی تھی پوری بات بتاتی ہے اور شکوہ کرتی ہے کہ ان لوگوں نے اسے فریبی کہا۔ لیکن اس کی پوری بات سننے کے بعد وہ نیک عورت بھی شک میں مبتلا ہو جاتی ہے اور سوچتی ہے کہ کہیں سب کچھ ایک پُر فریب کھیل نہ ہو اور کہانی اسی مقام پر ختم ہو جاتی ہے۔ سچ کیا ہے اس پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ وہ عورت ایک مظلوم اور بے سہارا عورت بھی ہو سکتی ہے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ شاید وہ فریبی ہو۔

آپ بتائیے

1. کسی ندی میں طغیانی کے سبب سیلاب آیا اور لوگوں کو اپنا گھر اور گاؤں چھوڑنا پڑا۔ اور کیوں؟
2. ستمبر ماہ کی کس تاریخ کو سب سے زیادہ بارش ہوئی تھی اور تیز بارش کی وجہ سے پھلگو ندی کا پانی جب گاؤں میں داخل ہو گیا تھا تو وہ رات کا وقت تھا یا دن کا؟
3. کہانی سنانے والی عورت کے گھر میں جب پانی داخل ہو گیا تو اس وقت وہ کس کام میں مصروف تھی؟
4. فرطِ خوف سے عورت بے ہوش ہو گئی تھی، جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے خود کو کہاں پایا تھا؟
5. کہانی سنانے والی عورت کا ایک بچہ سیلاب میں گم ہو گیا تھا، اس بچے کا نام کیا تھا اور اس کی عمر کتنی تھی؟

مختصر گفتگو

1. سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لیے عورت نے کیا فیصلہ کیا تھا اور وہ کس شہر میں جانا چاہتی تھی؟
2. عورت کا شوہر اور بڑا بیٹا گاؤں میں رہتے تھے یا کسی شہر میں؟ اگر شہر میں رہتے تھے تو اس شہر کا نام تحریر کریں۔
3. عورت نے کتنے دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا؟ اسے کھانے کے لیے کس نے دیا؟ عورت نے کھانا ملنے کے بعد کیا خود کھانا کھایا؟
4. عورت کو سیلاب کی وجہ سے ہونے والی بربادیوں میں کس چیز کے برباد ہو جانے کا افسوس اور صدمہ سب سے زیادہ تھا؟
5. عورت کا بڑا بیٹا جو رنگون میں ملازمت کرتا تھا اس کی شادی کتنے دنوں قبل ہوئی تھی؟ وہ شہر میں کس کے ساتھ رہتا تھا؟

تفصیلی گفتگو

1. بہار میں شکیلہ اختر کو تمام خواتین افسانہ نگاروں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اپنا خیال تحریر کریں۔
2. شکیلہ اختر کے علاوہ بہار کی چند دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے نام تحریر کریں۔
3. شکیلہ اختر کہاں کی رہنے والی تھیں؟ اس مقام کا نام تحریر کریں، ساتھ ہی یہ بھی بتائیں کہ اب وہ جگہ کس ضلع میں واقع ہے؟
4. شکیلہ اختر کے افسانوں کے کل کتنے مجموعے شائع ہوئے؟ ان کے مجموعوں کے نام تحریر کریں۔ (کئی افسانوں کو جب ایک جگہ جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کیا جاتا ہے تو اس کو مجموعہ کہتے ہیں)
5. شکیلہ اختر نے تعلیم کہاں تک حاصل کی تھی اور ان کے والد کا نام کیا تھا؟

آیئے، کچھ کریں

1. مصیبت زدہ عورت جب مدد مانگنے کی غرض سے ایک جگہ جاتی ہے تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے فریبی تصور کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہ ہو سکتی ہیں؟ (لفظ وجوہ وجہ کی جمع ہے)
2. پوری کہانی پڑھنے کے بعد آپ نے کیا اثر قبول کیا؟ اپنی تباہی و بربادی کا قصہ سنانے والی عورت کیا فریبی تھی؟ یا اس پر غلط شک کیا گیا تھا؟ اپنے تاثرات قلم بند کریں۔
3. بہار کے چند مشہور افسانہ نگاروں کی تصویر جمع کر کے اپنے اردو کے استاد کو دکھائیں۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL

الفانسو داوے

الفانسو داوے فرانسیسی ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ یہ افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ان کی پیدائش 1840 ء
میں فرانس کے ایک شہر نائمس میں ہوئی۔ انہوں نے طویل ناول اور مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے نثری کارنامے طویل
ہیں۔ کئی ناول انہوں نے یادگار چھوڑے ہیں جو فرانسیسی ادبیات میں قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ ناولوں کے علاوہ انہوں۔
فرانسیسی افسانے بہت لکھے ہیں۔

ان کے افسانوں میں 'آخری سبق' بھی ہے جو فرانسیسی حب الوطنی سے معمور ہے۔ اس افسانے میں اپنے وطن سے
محبت کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔

آخری سبق

اُس روز صبح کو میں بہت دیر میں اسکول روانہ ہوا تھا۔ اور دل ہی دل میں سہم رہا تھا کہ ماسٹر صاحب آج ضرور بگڑیں اور برسیں گے۔ زیادہ ڈر اس خیال سے تھا کہ موسیو ہیمل نے کہہ رکھا تھا کہ آج وہ ہم سے گردانیں سنیں گے اور میری یہ کیفیت تھی کہ ان کا ایک لفظ بھی یاد نہ تھا۔ ذرا دیر کو یہ خیال میرے دل میں آیا کہ بھاگ چلوں اور آج کا دن کہیں اِدھر اُدھر پھر کر گزار دوں۔ سردیوں کا ہلکا ہلکا گرم اور روشن دن تھا۔ بن کے کنارے چڑیاں درختوں پر چہچہا رہی تھیں۔ چکی کے پچھواڑے کھلے میدان میں جرمن سپاہی قواعد کر رہے تھے۔ یہ چیزیں گردانوں سے بہت زیادہ ترغیب انگیز تھیں۔ لیکن میں دل کا اتنا کمزور نہ تھا کہ خواہشوں پر غالب نہ آ سکتا۔ چنانچہ میں جلدی جلدی قدم اٹھا کر اسکول روانہ ہو گیا۔

میں ٹاؤن ہال کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ جس تختے پر اشتہار لگائے جاتے ہیں اس کے سامنے لوگوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے پچھلے دو سالوں سے جو بُری خبر بھی آئی تھی وہ اشتہارات کے اسی تختے پر سے پہلے پہل پڑھی گئی تھی۔ فوجوں کی شکست کی خبریں، اعلانات، فوجی افسروں کے احکامات وغیرہ۔ چنانچہ گزرتے گزرتے میں نے سوچا اب کیا قصہ ہو گیا؟

میں بڑی پھرتی سے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا کہ واچڑ لوہار نے جو اپنے ایک شاگرد سمیت وہاں موجود تھا۔ اشتہار پڑھنے کے بعد پکار کر مجھ سے کہا:

'میاں صاحبزادے اتنی جلدی میں کیوں ہو۔ اسکول پہنچنے کے لیے بہت وقت ہے۔'

میں نے سوچا۔ یوں ہی میری ہنسی اڑا رہا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی پروا نہ کی۔ اور ہانپتا کانپتا موسیو ہیمل کے ننھے سے باغیچے میں جا پہنچا۔ عام طور پر جب اسکول میں پڑھائی شروع ہوتی تھی تو ایسی گہما گہمی سی ہو جاتی تھی جس کی آواز باہر سڑک پر سے سنائی دیتی تھی۔ کہیں ڈسک کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ کہیں سب مل کر بڑی اونچی آواز میں سبق دہراتے اور ہاتھ کان پر رکھ لیا کرتے تھے کہ زیادہ اچھی سنائی دے۔ ساتھ ساتھ استاد کا بھاری رول بار بار

میز پر برستا رہا کرتا تھا۔ لیکن آج ہر طرف چپ چاپ تھی۔ میرا خیال تھا کہ شوروغل میں بغیر کسی کو نظر پڑے اپنے ڈسک پر جا بیٹھوں گا۔ یہ کیا معلوم تھا کہ مدرسے میں آج اتوار کی سی خاموشی کا عالم نظر آتا ہے۔ کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ تمام ہم جماعت اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے ہیں اور موسیو ہیمل لوہے کا ہیبت ناک رول بغل میں دبائے جماعت میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ دروازہ کھول کر سب کی نظروں کے سامنے اندر داخل ہوں۔ آپ خود تصور فرما سکتے ہیں کہ شرم اور خوف کے مارے میری کیا حالت ہو رہی ہوگی۔

پر کچھ بھی نہ ہوا۔ موسیو ہیمل نے مجھے دیکھا اور بڑی شفقت سے کہا: 'فرنیز میاں! جلدی سے جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہارے بغیر ہی سبق شروع کرنے والے تھے۔'

میں جلدی سے بنچ پھلانگ کر گزرا اور اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ جب ڈر ذرا کم ہوا اور میرے حواس درست ہو گئے تو اس وقت میں نے دیکھا کہ ماسٹر صاحب نے اپنا خوش نما ہرا کوٹ جھالر دار قمیض اور سیاہ ریشم کی ننھی سی کامدار ٹوپی پہن رکھی ہے۔ یہ وہ لباس تھا جسے وہ صرف معائنہ یا تقسیم انعام کے روز پہنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام مدرسہ کچھ عجیب طرح انوکھا اور متین سا نظر آ رہا تھا۔ لیکن جس بات پر مجھے سب سے زیادہ اچنبھا ہوا۔ وہ یہ تھی کہ پچھلی نشستیں جو عام طور پر خالی رہا کرتی تھیں۔ آج ان پر ہماری طرح گاؤں کے دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھا ہوسر اپنی تکون ٹوپی پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ شہر کا پرانا میئر، پرانا پوسٹ ماسٹر اور کئی لوگ بھی موجود تھے۔ ہر شخص اداس نظر آتا تھا۔ بوڑھا ہوسر بازار سے ایک قاعدہ لے آیا تھا۔ اسے کھول کر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا تھا اور اس کے صفحوں پر اس کی عینک رکھی ہوئی تھی۔

میں ان انوکھی باتوں پر حیران ہی ہو رہا تھا کہ موسیو ہیمل اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور اسی متین و شفیق آواز سے جس میں مجھ سے بات کی تھی۔ بولے:

'میرے بچو! آج میں تمہیں آخری سبق دوں گا۔ برلن سے احکام آ چکے ہیں کہ الساس اور لورین کے مدرسوں میں صرف جرمن زبان پڑھائی جائے گی۔ کل نیا ماسٹر آ جائے گا۔ یہ تمہارا فرانسیسی کا آخری سبق ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ آج تم بہت متوجہ رہو۔'

یہ لفظ کیسے بجلی کی طرح میرے دل پر گرے۔ آہ آپ کم بختو۔ اسی بات کا اعلان تم نے ٹاؤن ہال کے باہر لگا رکھا تھا۔

میرا فرانسیسی کا آخری سبق! مجھے تو ابھی لکھنا بھی نہ آیا تھا۔ اب میں کچھ بھی نہ سیکھ سکوں گا، جہاں ہوں وہیں رک کر رہ جاؤں گا۔ مجھے کتنا قلق ہوا۔ میں اپنا سبق یاد نہ کیا کرتا تھا۔ گھونسلوں سے چڑیوں کے انڈے چرانے اور دوسرے کھیلوں میں وقت کھونے نکل جایا کرتا تھا۔ کتابیں جو ذرا دیر پہلے میرے لیے مصیبت بن رہی تھیں اور اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ گرامر اور فرنچ کی کتابیں اب ایسی پرانی دوست معلوم ہو رہی تھیں کہ جن سے رشتہ توڑنا کسی طرح ممکن نہ نظر آتا تھا۔ اس طرح موسیو ہیمل کی بابت یہ خیال کہ وہ اب جا رہے ہیں اور پھر کبھی نہ ملیں گے، ان کے رول اور ان کی سخت مزاجی کی یاد کو دل سے مٹائے دے رہا تھا۔

کم نصیب شخص! اس آخری سبق کے اعزاز میں آج تو نے بہترین جوڑا پہن رکھا ہے۔ اب میں نے سمجھ لیا کہ شہر کے بوڑھے آج کیوں پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ آج انہیں بھی رہ رہ کر قلق ہو رہا تھا کہ زیادہ دنوں اسکول کیوں نہ گئے؟ وہ اپنے طریق پر اس شخص کا شکریہ ادا کر رہے تھے جس نے چالیس سال تک نہایت خلوص و دیانت سے ان کی خدمات انجام دی تھیں۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق اس مادر وطن کی تعظیم کرنے کو جمع ہوئے تھے جس کے وہ اب مالک نہ رہے تھے۔

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں میرا نام لیا گیا۔ اب سبق سنانے کی میری باری تھی۔ اس وقت کوئی مجھ سے میرا سب کچھ لے لیتا۔ اور تمام خوفناک گردانیں مجھے کسی ایسی طرح سکھا دیتا کہ میں بلند آواز سے واضح طور پر بغیر کسی غلطی کے انہیں دہرا سکتا۔ لیکن چند لفظ ہی بول کر میں رہ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے ڈیسک کو پکڑ رکھا تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ نظریں اٹھانے کی جرأت نہ پڑتی تھی۔ موسیو ہیمل نے مجھ سے کہا:

'فرنیز! میں تمہیں برا بھلا نہ کہوں گا۔ تمہارا جی برا ہوگا لیکن دیکھو۔ ہر روز تم اپنے دل میں کہتے رہے کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ میں کل اپنا سبق یاد کرلوں گا اور آج اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ آہ! الساس کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو کل پر ڈالتا رہتا ہے۔ اب دشمن کیا کہا کریں گے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو کہتے تو فرانسیسی ہیں لیکن انہیں نہ فرانسیسی بولنا آتا ہے نہ لکھنا۔ لیکن ننھے بچے اس میں صرف تیرا ہی قصور نہیں ہم سب کے سب مجرم ہیں۔'

'تمہارے ماں باپ کو تمہیں تعلیم دینے کا کچھ زیادہ شوق نہ تھا۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتے کہ تم کسی کھیت یا چکی میں کام شروع کر دو گھر کی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ ہو جائے۔ اور میں؟ میں بھی قصوروار ہوں۔ کئی مرتبہ بجائے اس کے میں تمہیں سبق پڑھاؤں میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ جاؤ میرے باغیچے کے گملوں میں پانی دے آؤ؟

جب میں مچھلی کے شکار کو جانا چاہتا تو اس روز اسکول میں چھٹی نہ کر دیتا تھا؟'

اس طرح ایک بات سے دوسری بات نکالتے نکالتے موسیو ہیمل نے فرانسیسی زبان پر گفتگو شروع کر دی او
کہا کہ یہ دنیا کی سب سے پیاری سب سے واضح اور منطق کے مطابق زبان ہے۔ اس وقت اس بے بس زبان کی
حفاظت اور اسے اپنے میں زندہ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ جو غلام قومیں اپنی زبان کو یاد رکھتی ہیں، اپنے قید خانے کی چا
گویا ان کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اس کے بعد موسیو ہیمل نے قواعد کی کتاب کھولی اور ہمیں سبق پڑھایا۔ میں حیرا
تھا کہ آج سبق کیوں دل میں اترا جا رہا ہے وہ کچھ بھی کہتے۔ بہت سہل اور آسان معلوم ہوتا تھا۔ میرا یہ بھی خیال
کہ نہ میں نے اپنا سبق کبھی ایسی توجہ سے سنا تھا اور نہ کبھی انہوں نے اسے صبر اور تحمل سے پڑھایا تھا۔ ایسا معلوم ہو
تھا کہ رخصت ہو جانے سے پیشتر یہ دردمند شخص چاہتا ہے کہ جو کچھ خود جانتا ہے ہمیں بھی سکھلا دے اور کسی طر
سب باتیں ایک ہی بار ہمارے دلوں میں اُتار دے۔

قواعد کے بعد ہمیں خوش خطی کا سبق ملا۔ اس روز موسیو ہیمل ہمارے لیے نئی کاپیاں لائے تھے۔ جن پر الف
فرانس الساس فرانس الساس بڑے خوش خط لکھے ہوئے تھے۔ ہمارے ڈیسک کے اوپر ننھی ننھی چھڑیاں کھڑی کر
کاپیاں ان پر ٹانگ دی گئی تھیں اور ٹنگی ہوئی وہ ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا تمام کمرے میں ننھی ننھی جھنڈیاں لہرا ر
ہیں۔ اس روز آپ دیکھتے کہ ہر طالب علم کس طرح اپنے کام میں مصروف تھا اور جماعت میں کیسا سکوت طاری تھ
آواز تھی تو محض قلم کے کاغذ پر چلنے کی۔ ایک بار چند بھونرے کمرے میں گھس آئے پر کسی نے ان کا خیال بھی نہ ک
ننھے بچوں نے بھی ان کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ اپنی کاپیوں میں مچھلی پکڑنے کی کارٹونی تصویر ایسے انہماک سے ٹر
کر رہے تھے گویا یہ بھی فرانسیسی سیکھنے کا ایک حصہ تھا۔ باہر چھت کے کنگروں پر کبوتر بیٹھے ہلکے ہلکے غٹرغوں غٹرغ
کر رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا:

'یہ لوگ کبوتروں کو بھی جرمن میں غٹرغوں کرنا سکھائیں گے؟'

جب کبھی میں لکھائی کے کام پر سے سر اٹھاتا تو دیکھتا کہ موسیو ہیمل بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھے ہیں ک
ایک چیز کو تکتے ہیں کبھی دوسری کو گویا یہ بات اپنے دل میں جما لینا چاہتے ہیں کہ اس ننھے سے کمرے میں ہر چیز
نظر آ رہی ہے۔ سوچیے تو! چالیس سال تک یہ شخص یہیں رہا تھا۔ سامنے جماعت بیٹھی رہتی تھی اور دریچوں میں
اس کا ننھا باغیچہ نظر آیا کرتا تھا۔ ڈیسکیں اور بنچ اس کی نظروں کے سامنے گھس کر پرانے ہو گئے تھے۔ باغیچے میں

کے پیڑ اس کے دیکھتے دیکھتے بلند ہوئے تھے۔ انگور کی بیلیں جو خود اس نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھیں، دریچوں کے گرد بل کھاتی ہوئی چھت تک جا پہنچی تھیں۔ ہائے ان سب چیزوں کو چھوڑ کر چلے جانے سے اس کا دکھیا دل کیسا خون خون ہو رہا ہوگا۔ اوپر کی منزل میں اس کی بہن کے اِدھر اُدھر پھرنے کی آواز آرہی ہوگی وہ اسباب باندھنے میں مشغول تھی۔ بس اگلے دن اس شخص کو السا س سے رخصت ہو جانا تھا۔

لیکن پھر بھی اس شخص میں اتنا حوصلہ تھا کہ آخری دم تک ہر سبق سنتا رہا۔ خوش خطی کے بعد ہمیں تاریخ کا سبق ملا اور اس کے بعد ننھے بچے ابجد دہراتے رہے۔ پچھلی نشستوں میں اب بوڑھے ہوسر نے عینک لگائی تھی اور اپنا قاعدہ دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر بچوں کے ساتھ ہجوں کی مشق کر رہا تھا۔ آپ موجود ہوتے تو دیکھتے وہ پڑھ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔ ایسی عجیب معلوم ہوتی تھی کہ کبھی ہم چاہتے ہنس پڑیں اور کبھی چاہتے کہ اس کے ساتھ مل کر رونے لگیں۔ آہ! وہ آخری سبق مجھے کیسی اچھی طرح یاد ہے۔

اتنے میں گھڑی نے بارہ بجائے۔ اس کے ساتھ ہی جرمن سپاہیوں کے بگل کی آواز سنائی دی۔ وہ قواعد سے فارغ ہو کر باہر گزر رہے تھے۔ موسیو ہیمل کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ مگر جیسے بلند و بالا وہ اس وقت نظر آتے تھے پہلے کبھی نظر نہ آئے تھے۔

وہ بولے: 'میرے دوستو! میں ...... میں ......' کسی چیز نے ان کا گلا گھونٹ دیا تھا وہ اور کچھ نہ بول سکے پھر وہ بلیک بورڈ کی طرف مڑ گئے۔ چاک کا ایک ٹکڑا لیا اور اپنی پوری قوت سے کام لے کر جس قدر بڑے الفاظ میں لکھ سکتے تھے۔ انھوں نے بلیک بورڈ پر لکھ دیا۔۔۔

'زندہ باد فرانس!'

پھر وہ رک گئے۔ اپنا سر دیوار سے ٹیک دیا اور بغیر کوئی لفظ منہ سے نکالے صرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جس کے معنی تھے۔۔۔ 'اسکول بند ہو گیا۔ اب تم جا سکتے ہو۔'

لفظ و معنی

سہم – ڈر

احکام – حکم

ہیبت ناک ۔ خوف ناک

حواس ۔ ہوش

نصیب ۔ مقدر

جرأت ۔ ہمت

قوت ۔ طاقت

مشغول ۔ مصروف

شدت ۔ تیزی

آپ نے پڑھا

- فرانسیسی افسانہ نگار کا یہ افسانہ ایک سبق آموز کہانی ہے۔ درس و تدریس سے متعلق یہ ایک کہانی ہے جس میں طلبہ کو درس و تدریس کے عملی تجربہ سے روشناس کرایا گیا ہے۔ فرانس کے ملک میں ایک استاد اسکول میں فرانسیسی زبان کی تعلیم دے رہے تھے۔ کہانی کے پس منظر میں آج استاد کے درس کا آخری سبق تھا جس میں استاد کے طویل تدریسی عمل کا ذاتی تجربہ بھی تھا اور دوسری طرف انواع و اقسام کے طلبہ سے ملنے کا مشاہدہ بھی تھا۔ یہ فرانسیسی زبان اور اسی ملک کے سماجی پس منظر کی کہانی ہے جس کا یہ اردو ترجمہ ہے۔

آپ بتائیے

1. طالب علم کس کے خوف سے سہم رہا تھا؟

(الف) ماسٹر کے (ب) ہیڈ ماسٹر کے (ج) مونیٹر کے (د) اپنے گارجین کے

2. طالب علم کے دل میں ذرا دیر کے لیے کیا آیا؟

(الف) بھاگ جانے کا (ب) اسکول نہ جانے کا (ج) بھیگ جانے کا (د) بخار آجانے کا

3. ماسٹر صاحب کے کوٹ کا رنگ کیسا تھا؟

(الف) لال (ب) ہرا (ج) پیلا (د) نیلا

4. ماسٹر صاحب نے کیسے رنگ کے ریشم کی ٹوپی پہن رکھی تھی؟

(الف) سبز ریشم (ب) سیاہ ریشم (ج) سفید ریشم (د) نیلے ریشم

5. ماسٹر صاحب نے بلیک بورڈ پر کیا لکھ دیا؟

(الف) زندہ باد فرانس (ب) زندہ باد جرمن (ج) زندہ باد جاپان (د) زندہ باد روس

مختصر گفتگو

1. کہانی 'آخری سبق' کے مصنف کا نام کیا ہے؟
2. مصنف کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟
3. فرنیز کو قواعد کے بعد کون سا سبق ملا؟
4. موسیو ہیمل کون تھے؟
5. درج ذیل الفاظ کی جمع بنائیے۔

حکم، لفظ، قدم، طرف، سبق

تفصیلی گفتگو

1. 'آخری سبق' کے مصنف کے بارے میں چند جملے لکھیے۔
2. 'آخری سبق' کا خلاصہ لکھیے۔
3. کہانی 'آخری سبق' سے آپ کو کیا نصیحت ملتی ہے؟
4. کہانی 'آخری سبق' کا موضوع کیا ہے؟

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد سے پوچھ کر چند فرانسیسی کہانی کاروں کے نام لکھیے۔
2. حب الوطنی کے موضوع پر دس جملے لکھیے۔
3. دنیا کے نقشہ پر فرانس کو تلاش کیجیے۔

باد پیما کی یہ دلربا کہانی

سترھویں صدی کے وسط تک سائنس دانوں کا خیال تھا کہ قدرت میں خلا (Vaccum) کے لیے زبردست دہشت ہے۔ یہ عقیدہ کہ قدرت خلا کو ناپسند کرتی ہے۔ (Nature abhors a vaccum) پمپ کی کارکردگی کی بنیاد ہے۔

پمپ میں ایک لمبا پائپ ہوتا ہے جس کا ایک سرا اس پانی میں ڈوبا رہتا ہے جس کو نکالنا ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرا سرا بیرل یا اسطوان (barrel or cylinder) سے جڑا ہوتا ہے جب پمپ کے ہینڈل (Handle) کو اوپر نیچے کیا جاتا ہے تو سلنڈر میں ایک جزوی خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ قدیم زمانے کے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ چونکہ قدرت کو خلا ناپسند ہے۔ اس لیے اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے پانی اوپر چڑھ آتا ہے۔

ایک روایتی کہانی کے مطابق 1640 میں ٹسکنی (Duke of Tuscany) کے گرانڈ ڈیوک نے اپنے محل کی زمین میں کنواں کھدوانے کا فیصلہ کیا۔ مزدوروں کو زمین اس سے زیادہ کھودنی پڑی جتنی کہ عموماً ضرورت پڑتی تھی کیونکہ پانی ان کو اس وقت تک نہیں ملا جب تک انہوں نے زمین چالیس فٹ گہرائی تک نہیں کھودی۔ پھر ایک پمپ بنایا گیا جس کا پائپ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ تب پانی اوپر لانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن پانی اوپر نہیں آیا اور سب لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ ان لوگوں نے کئی گنا طاقت سے ہینڈل کو اوپر نیچے کیا لیکن کئی بار کی کڑی محنت کے باوجود پانی اوپر نہیں آیا۔ تب لوگوں نے خیال کیا کہ شاید پمپ (Pump) میں کچھ نقص ہے لیکن غور سے دیکھنے کے بعد بھی کچھ گڑبڑ معلوم نہیں ہو سکی۔

ڈیوک کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی۔ لیکن وہ بھی مزدوروں کی طرح اس کا سبب سمجھنے میں قاصر رہا۔ اس زمانے میں بہت سے ذی حیثیت لوگ جیسے ڈیوک مشہور سائنس دانوں کے سرپرست بن جاتے تھے یعنی وہ ان کو ایک معقول مشاہرہ دیا کرتے تھے تاکہ وہ اپنی روزی دوسرے ذرائع سے کمانے سے سبکدوش ہو کر اپنی تمام تر توجہ

ائنسی معلومات پر لگا سکیں۔ پمپ کے واقعہ کو ناکام ہونے کے کئی برس قبل گیلیلیو کو گرانڈ ڈیوک کا 'فلاسفر اور غیر معمولی حساب داں' مقرر کیا گیا تھا۔ اس لیے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ڈیوک اس طرف رجوع ہوا۔

یہ دیکھا گیا کہ پائپ اٹھارہ ہتھیلیوں (Eighteen Palms) تقریباً 33 فٹ پائپ پر اٹھا، اس سے زیادہ نہیں۔ گیلیلیو نے اس کی وضاحت اس طرح کی کہ قدرت نے اگرچہ خلا کو ناپسند کیا لیکن اس کی ناپسندیدگی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب پانی ہتھیلیوں تک یا اس سے آگے گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن بذات خود اس دلیل سے غیر مطمئن تھا کیونکہ وہ ایک ضعیف انسان تھا۔ اس لیے اس نے اپنے ایک شاگرد جس کا نام ٹوریسیلی (Torriselli) تھا، اس کو مسئلہ کا حل نکالنے کے لیے کہا۔

ٹوریسیلی نے اپنا کام اس اصول پر شروع کیا کہ ایک پمپ ایک بھاری رقیق کو اتنی اونچائی تک نہیں اٹھا سکتا جتنا کہ ایک ہلکے رقیق کو۔ اس لیے اس نے پارے کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ پارہ اسی حجم کے پانی سے ساڑھے تیرہ گنا بھاری ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو امید تھی کہ پمپ پارے کو زیادہ سے زیادہ 33 فٹ منقسم 13 یعنی تقریباً 1030 انچ اٹھا سکے گا پارے کو استعمال کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ 33 فٹ لمبی نلی کے بجائے تقریباً ایک گز لمبی ٹیوب کافی ہوگی۔ جس کو استعمال کرنا آسان ہوگا۔

اس نے ایک کانچ کی نلی لی۔ جس کا ایک سرا بند تھا۔ پہلے اس نے ٹیوب کو پوری طرح پارے سے بھر لیا اور اس کے بعد کھلے سرے پر اپنا انگوٹھا لگا کر اسے بند کر دیا اور اوندھا کر دیا اور نلی کو پارے سے بھرے ایک پیالے میں ڈبو دیا۔ اس طرح اس کا کھلا سرا زیر سطح رہا۔ جب اس نے اپنے انگوٹھے کو پارے کے کالم کے کھلے سرے سے اٹھایا تو وہ 30 انچ کا کالم موجود تھا اور نلی کے اوپر جہاں پہلے سے کچھ پارہ تھا، اب خالی جگہ تھی۔ جسے بعد میں ٹوریسلین خلا (Torricellian Vacumm) کہا گیا۔

اس تجربہ کے بہت عرصہ پہلے گیلیلیو نے دکھایا تھا کہ ہوا میں دیگر اشیا کی مانند وزن ہوتا ہے جو کہ پیالے میں پارے کی سطح پر کام کر رہا تھا۔ ٹیوب سے پارے کو گرنے سے روکنے کے لیے کام کر رہا ہے جب ٹیوب میں موجود پارے کا وزن پیالے میں موجود پارے کی سطح پر موجود ہوا کے دباؤ سے متوازن (Balanced) ہو جاتا ہے تو ٹیوب میں سے پیالے میں نیچے نہیں گرتا۔

ٹوریسیلی اب اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ پمپ کی ناکامی کی وجہ وثوق کے ساتھ بیان کر سکتا تھا۔ اس نے بتایا

کہ کنویں میں پانی کے اوپر موجود ہوا کا دباؤ اتنا ہے کہ وہ صرف ساڑھے تیرہ گنا یعنی 30 انچ گویا کہ تقریباً 34 فٹ پانی
پائپ کے اوپر بھیج سکتا ہے اور اس سے زیادہ اونچائی پر پہنچانے کی قوت اس میں نہیں ہے۔

اس تجربہ سے پمپ کی ناکامیابی کی وجہ معلوم ہو جانے کے علاوہ ہوا کے دباؤ کو ناپنے کا طریقہ بھی دکھلانے کا
موقع ملا۔ جلد ہی ٹوری سیلی کی پارے میں الٹی ہوئی نلی بادپیما یا بیرومیٹر (Barometer) کے نام سے مشہور ہو گئی۔
اور ہم آج تک ہوا کے دباؤ کو اس طرح سے بتاتے ہیں کہ یہ پارے کا اتنا بڑا کالم روکے گا جو انچوں تک اونچائی
دکھاتا ہے۔

1644ء کے آس پاس یہ حقیقت کہ ہوا دباؤ ڈالتی ہے ایک نوجوان فرانسیسی سائنس داں بلیس پاسکل
(Bllaire Pascal) کے علم میں آیا جو کہ رائن (Rouen) میں رہتا تھا۔ وہ اس بیان پر غور وفکر میں ڈوب گیا کہ 'ہم
سمندر کے پیندے میں رہتے ہیں جس میں بلاشبہ وزن ہے۔' اس نے خیال پیش کیا کہ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو جتنی کمی
ہمارے اوپر ہوا کی ہوگی۔ اتنی ہی کمی ہمارے اوپر ہوا کے دباؤ کی ہوگی۔ اس لیے اگر ایک بیرومیٹر ٹیوب (یعنی
ٹوریسیلی کا آلہ) کو زیادہ اونچائی تک لے جایا جائے جیسے ایک اونچے مینار پر تو ٹیوب میں پارے کے کالم کی لمبائی کم
ہو جانا چاہیے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ گرجا گھر کے مینار پر لے جا کر دیکھا جائے کہ بیرومیٹر کے پارے کے کالم کی اونچائی
میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ مینار اتنا اونچا نہیں ہے کہ وہ کوئی قطعی نتیجہ برآمد کر سکے۔ اس
لیے اس نے اپنے وطن کے پہاڑوں میں یہ تجربات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کلیر ماؤنٹ (Clermount) دیہات کا
رہنے والا تھا۔ یہ دیہات پیرس سے تقریباً دوسو میل جنوب میں تھا۔ یہ گاؤں ایک پہاڑ پیوڈی ڈوم (Puy De
Dome) کے نشیب میں واقع تھا۔ یہ پہاڑ تین ہزار فٹ اونچا ہے۔

پاسکل ایک بیمار آدمی تھا۔ اس کے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ کسی سخت محنتی کام سے پرہیز کرے۔ اس
لیے اس نے اپنے سالے کو اس کے لیے تیار کیا تاکہ یہ تجربہ وہ اپنے بجائے اپنے سالے سے کرا سکے۔ سالے کا نام
ایم پیریر (M. Perrier) تھا جو کلیر ماؤنٹ میں رہتا تھا۔

19 ستمبر 1648ء کو پیوڈی ڈوم پہاڑ کی چوٹی کو صبح ۵ بجے بادلوں کے پار دیکھا جاسکتا تھا اس لیے موسیو پیریر
نے اس دن تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے دوستوں کو جمع کیا اور ۸ بجے صبح تک پانچ آدمی جمع ہو گئے جو کہ

اپنے پیشوں میں ممتاز تھے اور بھی سائنس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ سبھی کوہ پیمائی کے لیے تیار ہو گئے۔

موسیو نے اپنے ساتھ کانچ کے دو ٹیوب لیے جو کہ چار فٹ لمبے تھے اور جن کا ایک سرا بند تھا۔ 20 پیالے لیے اور تقریباً 16 پونڈ پارہ۔ پہاڑ کی اوپری سطح پر پہنچ کر اس نے ٹوریسیلی کا تجربہ ایک کانچ کی نلی اور پارے سے کیا اور دیکھا کہ پارے کے کالم کی اونچائی ۲۶،۴ انچ تھی۔

اس نے یہ تجربہ دوسرے ٹیوب سے دہرایا اور اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ ہر ایک ٹیوب میں کالم کی اونچائی ایک سی تھی۔

پانچوں آدمی پیوڈی ڈوم کی چوٹی کی طرف روانہ ہوئے اور ایک الٹی ٹیوب کو اپنے دوست کے پاس چھوڑ گئے۔ جس نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کیا کہ وہ باقاعدگی سے تمام دن کالم کی اونچائی کو ناپتا رہے گا۔

چوٹی تقریباً تین ہزار فٹ اونچی تھی۔ وہاں پہنچنے پر ان لوگوں نے ٹوریسیلی کے تجربہ کو دہرایا اور دیکھا کہ پارے کی اونچائی ۲۳،۲ انچ تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ کالم کی اونچائی میں چلنے کے مقام کے مقابلے میں ۳،۲ انچ کمی ہوگئی ہے۔ انہیں امید تھی کہ پہاڑی کی چوٹی پر جا کر فرق ضرور آئے گا۔ لیکن دباؤ پیمائی (ایڈیکس) میں اتنا بڑا فرق پا کر انہیں یقین نہیں آیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ تجربہ مختلف طریقوں سے اور مختلف جگہوں پر کیا جائے۔ انہوں نے یہ تجربات پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹے بجلی گھر اور اسی علاقے میں مختلف مقامات پر کیے۔ یہاں تک کہ انہوں نے انتظار کیا کہ پہاڑ پر کہرا چھا جائے۔ اور پھر تجربہ دہرایا لیکن ہر جگہ چوٹی پر کالم کی اونچائی ۲۳،۲ انچ تھی۔

اب وہ نیچے اترنے لگے جب وہ اس مقام پر پہنچے جو تقریباً آدھی دوری پر تھا تو انہوں نے تجربہ کو دہرانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے مشاہدہ کیا کہ کالم کی اونچائی ۲۵ انچ ہو گئی ہے۔ چلنے کے مقام پر پہنچنے پر انہوں نے ٹیوب کو پھر چیک کی اور دیکھا کہ شمار یہی ہے یعنی ۲۶،۴ انچ۔

دوسری صبح پہاڑ کی چوٹی پر واقع اوریٹری (prient of the Oratory) کے پادری نے فرمائش کی کہ اس تجربہ کو کلیر ماؤنٹ کے نوٹری ڈوم کے اونچے مینار کی سب سے اونچی منزل میں دہرایا جائے۔ وہاں پر شمار کرنے سے ۰،۲ انچ کا فرق تھا۔ مینار تقریباً ۱۲۰ فٹ بلند تھا۔

تجربات کے نتائج کو پاسکل کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس نے فوراً ان تجربات کو پیرس کے بلند مینار پر دہرایا۔ اسے بھی تقریباً وہی نتائج ملے جو کہ اس کے سالے کو حاصل ہوئے تھے۔

پاسکل کے ان تجربات سے بلاشبہ یہ ظاہر ہوگیا کہ گیلیلیو کا یہ نظریہ کہ ہوا میں وزن ہوتا ہے، صحیح تھا۔ اور ہم ہوا کے سمندر کی تہہ میں رہتے ہیں جو ہم پر دباؤ ڈالے ہوئے ہے۔ ان تجربات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ٹوریسلی کی نلی کو پہاڑوں کی اونچائی یا ایٹی ٹیوڈ (high or attitude) کے ناپنے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور کرہ فضائی (Atmospheric Pressure) میں ہوا کے دباؤ کے ناپنے کے لیے بھی۔

الفاظ و معنی

دلربا ۔ دل کو موہنے والی

خلا ۔ خالی مقام

دہشت ۔ گھبراہٹ

عقیدہ ۔ پختہ خیال

سرا ۔ کنارہ

جزو ۔ ٹکڑا

پر کرنا ۔ بھرنا

ڈیوک ۔ نواب

پادری ۔ عیسائی مذہب کا عالم

عموماً ۔ عام طور سے

فٹ ۔ دوری یا گہرائی ناپنے کی اکائی

نقص ۔ کمی

اطلاع دینا ۔ خبر کرنا

سبب ۔ وجہ

ذی حیثیت ۔ حیثیت والے، امیر لوگ

سرپرست ۔ گارجین

معقول ۔ مناسب

سبکدوش ۔ ریٹائر

توجہ ۔ دھیان

رجوع کرنا ۔ لوٹنا، توجہ کرنا

وضاحت ۔ تفصیل، واضح کرنا

فلاسفر ۔ فلسفہ کا ماہر

بذاتِ خود ۔ اپنے آپ میں

ضعیف ۔ کمزور

رقیق ۔ بہنے والا مادّہ

منقسم ۔ تقسیم ہو جانا

اوندھا کرنا ۔ الٹا دینا

زیرِ سطح ۔ سطح کے نیچے

اشیاء ۔ شے کی جمع بمعنی چیز

وثوق ۔ یقین

قوت ۔ طاقت

سائنس داں ۔ سائنس کا علم جاننے والا

قطعی نتیجہ ۔ فیصلہ کن نتیجہ

آپ نے پڑھا

- یہ عقیدہ کہ قدرت خلا کو ناپسند کرتی ہے پمپ کی کارکردگی کی بنیاد ہے۔ اس سلسلے میں تجربات سترہویں صدی کے آخری میں ہوئے۔
- بادپیما کی تیاری میں ٹوریسیلی، گیلیلیو، پاسکل، موسیو وغیرہ کے تجربات نے اہم حصہ لیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ ہوا میں وزن ہوتا ہے اور ہم ہوا کے سمندر کی تہہ میں رہتے ہیں جو ہم پر دباؤ ڈالے ہوئے ہے۔

آپ بتائیے

1. زیرِ نصاب مضمون کے مصنف کا نام لکھیے۔

2. یہ مضمون کس زبان سے ترجمہ ہے؟

3. اس مضمون کے مترجم کون ہیں؟

4. کس موضوع پر یہ مضمون لکھا گیا ہے؟

مختصر گفتگو

1. اس مضمون کا تعلق کس ملک سے ہے؟ مختصراً بیان کیجیے۔

2. اس مضمون میں کن سائنس دانوں کا تذکرہ ہے سبھوں کے نام لکھیے۔

3. اس مضمون کی افادیت پر پانچ جملے لکھیے

تفصیلی گفتگو

1. فرانس میں سائنسی ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔

2. سائنس کی روشنی میں اس مضمون کا مرکزی خیال پیش کیجیے۔

3. درج ذیل کی تعریف کیجیے۔

پارہ، دباؤ، خلاء، سطح، بادپیما، رقیق، حجم، بیرومیٹر

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے سائنسی آلات کی ایک نمائش لگایئے۔

2. طلبہ کے ساتھ پارے کی کارکردگی پر ایک مباحثہ کیجیے۔

ناول

ناول نگاری ادب کی ایک شاخ ہے۔ ہماری زندگی، ماحول اور روزمرہ کے معاملات کی عکاسی اس فن کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ ناول مغربی ادب کی دین ہے۔

فیلڈنگ نے ناول کی تعریف اس طرح کی ہے۔ 'ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے۔' یعنی اس کے نزدیک المیہ کہانی ناول کے موضوع سے باہر ہے۔ فیلڈنگ کی یہ تعریف وسیع اور جامع نہیں۔ انگلستان کی ایک ادیبہ کلارا دیوز اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہے۔ 'ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے۔' غرضکہ ناول نگاری کا مقصد حقیقی زندگی کی ترجمانی ہے گویا ناول حیات کی تعبیر پیش کرتا ہے۔

ناول کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں:

پلاٹ، کردار، ماحول، مکالمہ، جذبات نگاری، فلسفۂ حیات، زبان

اردو ناول کے فن کو فروغ دینے والوں میں مولوی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، راشدالخیری، محمد طیب، مرزا محمد ہادی رسوا قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد کی نسلوں میں کرشن چندر، ممتاز مفتی، عبداللہ حسین، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، راما نند ساگر، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر، رضیہ فصیح احمد، صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، عبدالصمد، غضنفر، مشرف عالم ذوقی اور حسین الحق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد بھی ناول نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جو اس فن کو جلا بخشنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

رتن ناتھ سرشار

سرشار کا اصل نام پنڈت رتن ناتھ تھا اور سرشار تخلص رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش 1847ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ سرشار کے والد کا نام پنڈت تیج بہادر تھا۔ سرشار کشمیر کے باعزت برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سرشار کی عمر صرف چار سال کی تھی کہ پنڈت تیج بہادر کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ سرشار کا بچپن اپنی ماں کے ساتھ گذرا۔ ماں کی سرپرستی میں سرشار نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی، فارسی اور اردو زبانیں سیکھیں۔ سرشار بچپن ہی سے ذہانت اور جودت طبع سے آراستہ تھے۔

سن شعور کو پہنچنے کے بعد سرشار نے اینگلو عربک کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ لیکن طبیعت میں لاابالی پن تھا۔ اس لیے بغیر کوئی سند لیے ہی کالج کو خیرباد کہہ دیا۔ جب فکر معاش دامن گیر ہوئی تو کھیری ضلع کے ایک اسکول میں معلم ہوگئے۔ وہیں سے سرشار کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اسی دوران انہوں نے ایک کشمیری رسالہ 'مراسلہ کشمیری' کے لیے مضامین لکھنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ دیگر رسائل کے لیے بھی مضامین لکھتے تھے۔ ان مضامین کی وجہ سے ایک ادیب کی حیثیت سے سرشار کی ایک پہچان بن گئی۔

اسکول کی ملازمت میں قلیل مدت تک رہ کر سرشار لکھنؤ واپس آگئے۔ منشی نول کشور سے ملاقات ہوئی اور 'اودھ اخبار' کے مدیر ہوگئے۔ اسی زمانہ میں 'فسانۂ آزاد' کی تصنیف کا آغاز ہوا۔ یہ مضمون 79-1878 میں ایک سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ پھر 1880ء میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوگیا۔ سرشار کی مشہور تصانیف میں 'فسانۂ آزاد' کے علاوہ جامِ سرشار، سیر کہسار اور کامنی وغیرہ ہیں۔ لیکن 'فسانۂ آزاد' کی وجہ سے سرشار کو لازوال ادبی شہرت حاصل ہوئی۔

1894ء کے آس پاس سرشار 'اودھ اخبار' کی ادارت سے سبکدوش ہوکر حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں سرشار کو فراغت خوش حالی کی زندگی حاصل ہوئی۔ شاندار مستقبل اور شہرت کے دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن خوش حالی کا ایک منفی نتیجہ سامنے آیا کہ سرشار وہاں کی خوش حالی میں مے نوشی سے سرشار ہوگئے جس نے سرشار کی تخلیقی قوتوں کو رفتہ رفتہ سلب کر لیا یہاں تک کہ سرشار کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور 55 سال کی عمر میں 31 / جنوری 1903ء کو وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

عبرت اور نصیحت

لبِ چشمہ سار، لطافت بار، ایک گلشن پر بہار، روکشِ گلزار، فرخار میں، ایک پری تمثال جادو جمال نوجوان عورت، ہری بڑی دوب پر سفید چاندنی بچھائے بصد ناز و انداز دلربائی وشان برنائی متمکن ہے۔ سامنے ایک ادھیڑ عورت کھڑی باتیں کر رہی ہے۔ نوجوان عورت کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑی مصیبت سے بچ نکلی ہے۔ ہنس ہنس کر اپنی پچھلی مصیبت کی نسبت گفتگو کرتی ہے۔

نوجوان: (نو) اف بڑی مصیبت سے اللہ نے بچایا۔

خادمہ: کیسی کچھ

نوجوان: مگر سچ کہنا، کیا تدبیر سوجھی ہے۔ کیوں؟

خادمہ: اللہ جانتا ہے، اور کیوں کو نہ سوجھتی۔

نوجوان: مگر پتہ لگاتے رہیں گے، اب کیا کیفیت ہے۔

خادمہ: میں روز روز کا کچا چٹھا سناؤں گی۔

نوجوان: ہاں خوب یاد آیا۔ تم سے کیا واسطہ، مرے تو ہم۔

خادمہ: اللہ نہ کرے۔

نوجوان: اف! اس وقت تم سے ہنسی کیوں کر ضبط ہو سکی۔

خادمہ: بیوی مارے ہنسی کے برا حال تھا، اور ان کی یہ کیفیت کہ ڈھاڑیں مار مار کر روتیں۔ تو میں سمجھاؤں، کہ دیکھو دیکھو ایسا تو ہو سب راز کھل جائے کہ زہر کھایا ہے۔ بڑی دل لگی ہوئی۔ چہرہ زرد ہو گیا، اور ایک دفعہ بڑی زور سے آہ سرد بھر کر نعرہ مارا، اور گر پڑے کہا، ہائے افسوس اس کے پیچھے اوقات ضائع کی، مگر نتیجہ یہ نکلا۔ بڑی دیر تک لڑتے رہے، کہ میں بھی ساتھ چلوں گا میں نے کہا کچھ خبر ہے میاں۔ ہوش کی دوا کرو۔ ہم اسے اللہ جانے کس تدبیر سے دفنائیں۔ کس راہ سے جنازہ لے جائیں۔ ہمارا گاؤں، ہمارا محلہ، تم لاش لے کر نکلو، تو محلے بھر میں ہلڑ مچ

جائے۔ بہت روئے پیٹے۔

نوجوان: ان کو اپنے تن بدن کی تو سدھ ہی نہیں۔ میں کھانا نہ دیتی تو دو دو دن تک فاقہ ہی کرتے۔ جب کہوں، کھانا کھالو کہیں، خدمت گار کو بلاؤ، افضل، تفضل، فضل، یہ وہ۔ خدا جانے کیا کیا بکتے تھے۔ واہی تباہی۔ ایک دن کہہ بیٹھے کہ تم ہو کیا بے چاری۔ میں ایسی بری کے ساتھ نکاح کروں کہ تم بھی شرما جاؤ۔ بس دل پر ملال گذرا۔ دن میں سو سو بار بے ہودہ بکیں۔ ہاتھی لاؤ، گھوڑا کسو، بگھی نکالو۔ الٰہی توبہ ناک میں دم کر دیا۔ مارے رنج کے کھانا پینا حرام تھا۔ بارے خدا خدا کر کے مصیبت سے بچی۔

خادمہ: ہاں یہ تو سچ، مگر آپ نے اچھا نہ کیا۔

نوجوان: یہ کیوں؟

خادمہ: ہم ہوتے تو ضرور نکاح کر لیتے۔ آدمی صورت دار، ہزاروں روپیہ پاس، شریف، پڑھا لکھا، بد نہیں، مفت میں ایسے روپے والے کو ہاتھ سے کھو دیا۔ کوئی پوچھے ملا کیا تم کو۔

نوجوان عورت نے اس فقرے پر آہ سرد کھینچ کر کہا، تم کو کیا معلوم کہ ہم نے کس کو دل دیا ہے۔ اس کو دل دیا ہے جو اپنا دل کسی اور ہی کو دے چکا، مگر خیر خدا ہمارا بھی مالک ہے۔ یہ ایک راز کی بات ہے۔ ہم کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

ناظرین باتمکین سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ دونوں عورتیں کون ہیں، ان میں ایک جوگن ہے دوسری چمپا۔ اب اکثر اصحاب کو حیرت ہوگی کہ جوگن تو مر گئی تھی۔ انھوں نے زہر کھایا تھا۔ چمپا کا بھائی لاش کو دفنا آیا تھا۔ یہ پیدا کہاں سے ہو گئیں۔ سبب سنئے۔

حقیقت حال یوں ہے کہ جوگن نے چمپا کے ذریعہ سے ایک شخص کو بلایا تھا وہ موم کے کھلونے بنانے میں طاق تھا۔ جوگن نے اس کو بلا کر کہا کہ ایک عورت بنا لاؤ۔ مگر ہاتھ پاؤں، نقشہ، چہرہ قد و قامت، بعینہ ہمارا ہی سا ہو۔ چنانچہ وقت مقررہ پر وہ لے آیا۔ جوگن چلی گئی۔ چمپا نے ایک چادر اوڑھا دی اور چراغ گل کر دیا۔ باقی حال ناظرین کو خود ہی معلوم ہے۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ چمپا بار بار کہتی تھی کہ آپ ساتھ نہ چلئے، آپ الگ ہی رہئے، آپ غل نہ مچایئے۔ بڑی حسن لیاقت سے چمپا نے موم کی عورت کو اٹھوایا۔ شہسوار کو ذرا بھی نہ معلوم ہو کہ انھوں نے کیا کارروائی کی ہے۔

جوگن: میں اپنا حال کیا بتاؤں۔ میری تقدیر نے کس قدر پلٹے کھائے۔ افسوس پہلے کیا تھی پھر کیا ہوئی۔ اب کیا ہوں اور آئندہ خدا جانے کیا ہو، بے حیائی کی زندگی ہے کاٹے نہیں کٹتی۔

سنو چمپا! اللہ جانتا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم فنس پر سوار ہو کر ٹھسّے سے نکلتے تھے۔ بارہ بارہ سولہ سولہ کہار فنس اٹھاتے تھے اور یا ایک زمانہ اب ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ لونڈیا اور اصیلین تھیں۔ یا اب ایسا وقت آن پڑا۔

ہائے یہ سب ہماری حماقت اور آوارگی کا نتیجہ ہے۔ نہیں تو یہ دن ہم کیوں دیکھتے۔ اور اس میں ہمارے والدین کا بھی قصور تھا کہ ایک سن رسیدہ آدمی سے بیاہ کر دیا جس کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ہماری زندگی تلخ کر دی۔ فعل بد کا نتیجہ بھی بد ہے۔ ہائے ستم! میں نے کیا کیا۔ اس وقت اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری یہ درگت ہوگی تو کیوں ایسا کرتی۔

چمپا: بیوی جو کچھ آپ نے کہا سو کیا۔ ہمیں اس کا حال نہیں معلوم مگر بہت برا کیا کہ اس خوبصورت روپے والے کے ساتھ نکاح نہیں پڑھوایا۔ اب بھی سویرا ہے اور وہ آپ پر جان دیتا ہے۔

جوگن: چمپا تم کو ہمارے بھید سے اطلاع ہوتی، تو تم ایسا نہ کہتیں۔

چمپا: اب لے مجھے کیا معلوم۔

جوگن: ہائے افسوس میں نے کیا کیا۔ بڑی بری گھڑی تھی۔ یا خدا جو گت میری ہوئی۔ کسی شریف زادی کی نہ ہو۔

یہ کہہ کر جوگن بہت روئی۔ چمپا نے لاکھ لاکھ سمجھایا مگر آنسو نہ رکے۔ کیوں کر رکتے خدا جانے کیا آیا تھا

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

جوگن نے چمپا سے کہا، تم مجھے سمجھاتی کیا ہو، میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ میں عمر بھر رویا کروں۔ میں اپنی حماقت اور بے وقوفی اور غلطی پر روتی ہوں۔ یا خدا! کبھی کوئی شریف زادی ایسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو۔ چمپا متحیر تھی۔ اس کو جوگن کے دردِ دل کی خبر نہ تھی۔ بہ اصرار کہا کہ بیوی اب کسی اور بات کا ذکر چھیڑو۔ اللہ جانے آپ کو اس وقت کیا یاد آیا میری عقل ہی نہیں کام کرتی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی شخص نے یہ شعر پڑھا۔

نہ داغ یاس سے گھبرا بر آئے گی امید
گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا

جوگن نے جو یہ شعر سنا تو ذرا ڈھارس ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کہ یہ آواز کہاں سے آئی آخر کار ایک پیر مرد نظر آیا۔ جوگن اور پیر مرد کی آنکھیں چار ہوئی تو پیر مرد نے جوگن سے کہا اگر مضائقہ نہ ہو تو میں تیرے قریب آن کر بیٹھوں ورنہ خیر۔

جوگن: زہے نصیب آئیے۔

پیر مرد: میں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ تو اپنا حال تباہ کرتی ہے۔ دو گھنٹے سے زار زار روتے دیکھا۔ اس کے دو ہی سبب ہیں، یا فراق و درد اشتیاق یا افعال بد پر نفس کو لعنت و ملامت کرتی ہے۔

جوگن: ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔

جوگن نے کہا جب میں نے آپ کو دیکھا تب بھی ڈر گئی تھی وجہ یہ کہ آپ کے نہ داڑھی ہے اور نہ مونچھ اور پوشاک بھی دنیا سے نرالی ہے۔ پیر مرد نے مسکرا کر کہا۔ ہاں ہے تو ایسا ہی، مگر میری شکل اور وضع کا خیال نہ کرو۔ میری نصیحت پر دھیان رکھو۔

یہ کہہ کر پیر مرد نے جوگن سے التجا کی، کہ اگر جی چاہے اور عیب نہ سمجھو تو میرے ساتھ میرے گھر چلو۔

جوگن: کوئی عذر نہیں۔

پیر مرد: جھٹپٹے وقت چلو۔

جوگن: جب حکم ہو۔

جب آفتاب لب بام آیا تو پیر مرد جوگن کو لے کر اپنے گھر کی طرف چلے، چمپا ساتھ ساتھ تھی۔

چمپا: کیا آپ کا مکان یہاں سے دور ہے؟

پیر مرد: نہیں پاس ہی ہے۔

چمپا: پیسہ ڈولی، ٹکا ڈولی۔

پیر مرد: دو قدم ہے۔

جوگن: اس قدر بتا دیجیے کہ وہاں کون کون ہوگا؟

پیر مرد: میں اور ایک خادمہ۔
جوگن: بس تو پھر کیا حرج ہے۔
تھوڑی دیر میں پیر مرد نے کہا ' لو یہ مکان ہے۔ جوگن اور چمپا کو لے کر اپنے مکان میں داخل ہوئے اور کہا کہ تم دونوں یہاں صحن میں موڈھوں پر بیٹھو۔ میں آتا ہوں ابھی ابھی آیا یہ کہہ کر پیر مرد دالان کے اندر گئے، چراغ روشن ہوا، اور خادمہ نے آن کر کہا چلیے آپ کو بلاتے ہیں اور چمپا سے کہا تم یہیں بیٹھی رہو۔ جوگن جانے لگی تو چمپا نے کان میں کہا کہ ہمیں کچھ دال میں کالا کالا معلوم ہوتا ہے۔ اکیلا مکان، تیرہ و تاریک چراغ اب روشن ہوا۔ کبھی کی جان نہ پہچان۔ آپ نہ جایئے تو اچھا۔
جوگن: گھبراؤ نہیں خدا مالک ہے۔
چمپا: جیسی خوشی ہو۔
جوگن بے جھجک کمرے کے اندر چلی گئی۔ دیکھا کہ صاف ستھرے کمرے میں فرش مکلف بچھا ہے۔ چراغ روشن ہے۔ مگر مکیں ندارد خادمہ سے پوچھا پیر مرد کہاں گئے۔
خادمہ: (مسکرا کر) آتے ہیں۔
اتنے میں جوگن کیا دیکھتی ہے کہ ایک بوڑھی عورت کوٹھری میں سے برآمد ہوئی۔ جوگن کے پاس آن کر بیٹھی۔
جوگن نے کہا: آیئے۔ کیا آپ بھی اسی مکان میں رہتی ہیں۔
ضعیفہ: پہچانا؟
جوگن: کبھی دیکھا ہو تو پہچانوں۔ بن دیکھے کوئی کسی کو کیا پہچانے۔
ضعیفہ: مجھ کو دیکھا ہے آپ نے۔
جوگن: دیکھا ہوگا یاد نہیں آتا۔
ضعیفہ: سوچیے، غور کیجیے۔
جوگن: (خادمہ سے) پیر مرد کو بلاؤ۔ کہو صاحب اب آیئے۔
خادمہ: (ہنس کر) بہت خوب بلاتی ہوں۔
جوگن: اس میں ہنسی کی کوئی بات تھی۔ میں سمجھی نہیں۔

ABSOL PATNA

خادمہ: حضور کس کو بلواتی ہیں؟

جوگن: وہ جو پیر مرد ہمارے ساتھ آئے تھے۔ ہم کو ساتھ لائے تھے۔

خادمہ: وہ یہ کیا بیٹھے ہیں۔ (مسکرا کر) ہیں کہ نہیں۔

ضعیفہ: میں نے تو عمداً پوچھا کہ پہچانا۔ میں پیر مرد نہیں عورت ہوں۔

جوگن: میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ سے کہ داڑھی نہ مونچھ اور مردانہ وضع بھی عجیب وغریب، مگر نہیں سمجھی تھی کہ مرد نہیں ہیں۔ اچھا دھوکہ ہوا۔ آپ عورت ہیں۔

ضعیفہ :اب تم چین سے یہاں رہو اور جو کہنا، سننا، اور پوچھنا مشورہ لینا ہو، میں حاضر ہوں۔

سنو! اب میں تم سے اپنا حال صاف صاف بیان کردوں۔ میرا خاص پیشہ یہ ہے کہ شریفوں کی بہو بیٹیوں کو امور نیک کی تعلیم دوں، اور سیدھے دھرے پر لگاؤں تم دس پندرہ ہی دن اگر میرے ساتھ رہوگی تو سب حال تم پر کھل جائے گا کہ میں کیا کاروائی کرتی ہوں۔ اور کن کن شریف خاندانوں میں میرا گذر ہے۔ سب لوگ مجھ کو استانی بی بی کہتے ہیں۔

منجملہ اور خاندانوں کے استانی جی نے حسن آرا اور سپہر آرا کا بھی ذکر کیا کہ ان کے یہاں بھی میں جاتی آتی ہوں۔ جوگن ان دونوں کا نام سن کر چونک پڑی۔ متحیر ہو کر پوچھا کہ آپ ان کو جانتی ہیں؟

استانی: بخوبی دونوں بہنوں کو مثل اپنی خاص لڑکیوں کے سمجھتی ہوں۔

الفاظ و معنی

برآمد ہونا	۔	نکلنا
فرش مکلف	۔	سجایا ہوا فرش
خادمہ	۔	خدمت کرنے والی، دایہ
پیر مرد	۔	بوڑھا مرد
لب، چشمہ سار	۔	چشمہ کی طرح ہونٹ
پری تمثال	۔	پری کی طرح
دوب	۔	گھاس

بصد ناز و انداز ۔	سینکڑوں، ناز و نخرے کے ساتھ
متمکن ۔	جلوہ افروز
دلربائی ۔	محبوب کا انداز
کیفیت ۔	حالت
واسطہ ۔	تعلق
ضبط ہونا ۔	برداشت ہونا
ڈھاڑیں مار کر رونا ۔	زار و قطار رونا
چہرہ زرد ہونا ۔	گھبراہٹ سے پیلا پڑ جانا
اوقات ضائع ہونا ۔	وقت برباد ہونا
ہلڑ مچنا ۔	ہنگامہ ہونا
فاقہ ہونا ۔	بھوک مرنا
واہی تباہی ۔	فضول بکواس
ناک میں دم کرنا ۔	پریشان کرنا
رنج ۔	تکلیف
ناظرین ۔	پڑھنے والے، دیکھنے والے
سبب ۔	وجہ
چراغ گل ہونا ۔	چراغ بجھا دینا
غل مچانا ۔	ہنگامہ کرنا
حسن لیاقت سے ۔	اچھے طریقے سے
ٹھسے سے نکلنا ۔	شان سے نکلنا
اصیل ۔	لونڈی، کنیز
فعل بد ۔	برا کام
ستم ۔	ظلم

آپ نے پڑھا

- آپ نے سرشار کے لکھے ہوئے ایک ناول کا تھوڑا سا حصہ پڑھا جس میں ایک خادمہ اور اس کی مالکن یعنی جوگن اور چمپا کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بعد میں ایک بوڑھی عورت بھی سامنے آتی ہے جو اس جوگن کی اصلاح کے لیے کمر بستہ ہے۔

آپ بتائیے

1. سرشار کی پیدائش کب ہوئی؟
2. سرشار کا تعلق کس خاندان سے تھا؟
3. سرشار کا اصل نام کیا تھا؟
4. فسانۂ آزاد کے مصنف کون ہیں؟
5. سرشار کا انتقال کہاں اور کب ہوا؟

مختصر گفتگو

1. سرشار کا مختصر خاندانی پس منظر بیان کیجیے۔
2. سرشار کی تصنیفات کا تذکرہ کیجیے۔
3. اودھ اخبار سے سرشار کے تعلقات کا مختصر تذکرہ کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1. سرشار کی زندگی کے حالات بیان کیجیے۔
2. سرشار کی نثر نگاری کا عمومی جائزہ لیجیے۔
3. اردو میں ناول نگاری پر ایک مضمون سپرد قلم کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے غیر مسلم اردو شعرا و ادبا کی ایک فہرست تیار کیجیے۔
2. طلبہ کے ساتھ لائبریری میں جا کر اردو داستانوں کی ایک فہرست بنائیے۔

مضمون

کسی خاص موضوع پر جو تحریر لکھی جائے اسے ادبی اصطلاح میں مضمون کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے Essay لفظ مخصوص ہے۔

مضمون کے متعدد اقسام ہیں اور اکثر موضوع یا انداز تحریر کی وجہ سے انہیں الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ جس تحریر میں شعروادب کی تفہیم اور تعبیر وتشریح کی جائے، اسے تنقیدی مضمون کہا جاتا ہے۔ جس تحریر میں لکھنے والے کا نظر علمی ہو، اسے علمی مضمون کہا جائے گا۔ جس مضمون میں مضمون نگار ظریفانہ رخ اختیار کرے، اسے ظریفانہ مضمون کہا جائے گا۔ اس طرح انشائیہ بھی مضمون کی ایک قسم ہے۔

غیر افسانوی نثر میں مضمون نویسی کی اہمیت مسلم ہے۔ سرسید احمد خاں سے لے کر مہدی افادی تک ہر ادیب نے مضامین لکھے۔

حالات اور ضرورت کے تحت اس صنف کی نئی قسمیں بنتی رہی ہیں۔

علّامہ شبلی نعمانی

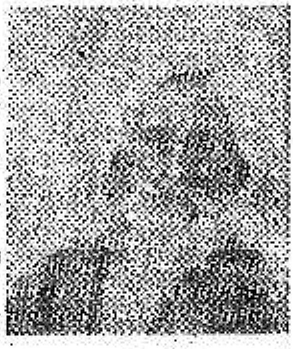

علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ کے مشہور وکیل مولوی شیخ حبیب اللہ کے فرزند تھے۔ ان کی پیدائش مئی 1857ء مطابق ذی قعدہ 1274ھ کو بندول ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ مولوی شکراللہ سے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد غازی پور گئے۔ وہاں مستند استاد مولانا محمد فاروق کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ مولانا ہی نے شبلی کے ساتھ نعمانی کا لفظ بڑھا دیا۔ رام پور میں انہوں نے فقہ اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے لاہور چلے گئے جہاں ان کو مولانا فیض الحسن پروفیسر اورینٹل کالج جیسا استاد مل گیا۔ عربی ادب کی تکمیل انہوں نے وہاں کی اور پھر سہارن پور میں مولانا احمد علی سے کتب حدیث کا درس لیا۔

شبلی کے والد چونکہ ایک کامیاب وکیل تھے اور ان کے استاد مولانا محمد فاروق بھی وکیل تھے، والد بزرگوار نے وکالت پاس کرنے کو کہا۔ شبلی نے والد کے حکم کی تعمیل میں وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کردی۔ لیکن اس پیشہ میں اکل حلال کا دروازہ انہیں بند محسوس ہوا۔ اس لیے اس سے الگ ہوگئے۔

1882ء میں شبلی علی گڑھ گئے۔ وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی۔ تبادلۂ خیال ہوا۔ ہم مزاجی محسوس ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوگئے۔ حسن اتفاق کہ ان دنوں علی گڑھ کالج میں ایک عہدہ پروفیسر کا خالی تھا۔ سرسید نے انھیں چالیس روپے ماہوار پر مقرر کرلیا۔ سرسید شبلی کی صلاحیتوں کے معترف ہوتے گئے۔ سرسید نے اپنا پورا کتب خانہ شبلی کو مطالعہ کے لیے وقف کردیا۔ شبلی 1892ء میں قسطنطنیہ پہنچے اور چند مہینوں تک بلاد اسلامیہ کا سفر کرتے رہے۔ 1894ء میں انھیں سلطنت ہند کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

سرسید کے انتقال کے بعد 1898ء میں شبلی مستعفی ہوکر اعظم گڑھ لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے نیشنل اسکول قائم کیا۔ پھر وہ حیدرآباد میں ناظم علوم وفنون کے عہدہ پر چار سال تک کام کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی تو شبلی اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ شبلی ندوۃ العلما لکھنؤ کے بھی ناظم مقرر ہوئے لیکن 1913ء میں اس سے بھی الگ ہوگئے۔ پھر اعظم گڑھ منتقل ہوگئے اور یہاں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس قومی خدمت کے لیے اپنا باغ، اپنا مکان اور کتب خانہ وقف کردیا۔ یہ ادارہ تحقیق وتصنیف کا کام کرتا رہا۔

علامہ شبلی کا نام اردو زبان وادب کی تاریخ میں بڑے ہی احترام سے لیا جاتا ہے اور ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی تصنیفات میں شعرالعجم، الفاروق، سیرۃ النبیؐ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ 57 سال کی عمر میں 18 نومبر 1914ء بہ مطابق 28 ذی الحجہ 1332ھ بروز چہار شنبہ کو علامہ شبلی کا انتقال ہوگیا۔

تعلیم قدیم و جدید

کیا ان میں سے کوئی غیر ضروری ہے؟؛ کیا ان دونوں میں تعارض ہے؟ کیا ان میں کسی اصلاح کی ضرورت ہے؟ دونوں مل کر کیوں کر کام کر سکتے ہیں؟

اگر چہ یہ سوالات قومی مسئلہ کے متعلق اہم اور ضروری سوالات ہیں۔ لیکن قوم نے کبھی ان سوالات پر مستقل حیثیت سے بحث نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو دنیوی اور دینی درس گاہیں یا انجمنیں ملک میں قائم ہیں۔ ان کو جو کامیابی اس وقت حاصل ہے وہ اس پر قانع تھیں۔ اس لیے ان مسائل کو حل کرنے کی ان کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مثلاً اسلامی کالجوں میں سیکڑوں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں۔ ہر سال سیکڑوں ایم۔ اے اور بی۔ اے ہو کر نکلتے ہیں۔ سیکڑوں فارغ شدہ طلبہ نے معقول نوکریاں حاصل کیں۔ سیکڑوں وکالت کر رہے ہیں۔ سیکڑوں اپرنٹس اور امیدوار ہیں۔ ان باتوں کے ہوتے ان کو اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ قدیم تعلیم کی ضرورت اور اس کے نتائج اور ترمیم و اصلاح کا سودا مول لیں۔

اس کے مقابلہ میں عربی مدارس دیکھ رہے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ مساجد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں مولوی تیار ہو گئے ہیں۔ ہر ہر ضلع میں عربی کے چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں۔ ہر جگہ واعظوں کی مانگ ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ان کو کیا غرض ہے کہ وہ جدید تعلیم کی ضرورت اور نتائج پر غور کرنے کی زحمت اٹھائیں۔

لیکن اب اس سکون میں کچھ جنبش پیدا ہو چلی ہے کیوں کہ اب ہر گروہ جس قسم کی تعلیم کا حامی ہے، چاہتا ہے کہ تمام ملک میں وہی تعلیم پھیل جائے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں گروہوں میں تقابل، مسابقت اور محاسدہ پیدا ہو۔ چنانچہ ایسا ہوا۔ صرف یہ امتیاز باقی رہا کہ پست حوصلہ لوگوں نے اعلانیہ اپنے حریف مدارس اور انجمنوں کی برائی شروع کی اور مہذب حضرات نے دل آزاری اور بدگوئی سے احتراز کیا۔

اگر چہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں سے دونوں کو بہ قدر کافی اپنے کام کے لیے مدد ل

سکتی ہے۔لیکن واقعی اب اس کا وقت آگیا ہے کہ تمام قوم مل کر ایک وسیع خاکہ تیار کردے جس میں تمام درس گاہوں اور انجمنوں کی نسبت طے کردیا جائے کہ کون کون ضروری ہیں، کس حد تک ضروری ہیں اور مجوزہ نقشہ ہر ایک کی جگہ کہاں ہے؟ تاکہ جو کام ہورہے ہیں، سب مل کر ایک کام بن جائیں اور ایک کام دوسرے کام میں خلل انداز نہ ہونے پائے ورنہ دو طرفہ کشمکش میں ہزاروں لاکھوں مسلمان یہ فیصلہ نہ کرسکیں گے کہ وہ کس رخ اور کدھر جائیں؟

اس غرض سے سوالاتِ ذیل پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

علی گڑھ، دیوبند، ندوہ کے کیا حدود ہیں اور کون کون کام کس کس کے حدعمل میں چھوڑ دینے چاہئیں۔

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا اور اگر کسی کو ہو تو ہم کو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن میں دفعتاً نفی کی صورت میں آئے گا، لیکن ان کو ذرا غور سے کام لینا چاہئے اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہیے۔

کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟

اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم، قدیم تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے، لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہوسکتی ہے۔ کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کرسکتے ہیں۔ کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں، ان کے مقابلہ کے لیے اتنی تعلیم کافی ہے؟ کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہوسکتا ہے؟

تیسرا سوال یعنی یہ کہ دونوں طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں، ایک معرکہ کا سوال ہے۔ نہ اس لئے کہ در حقیقت وہ ایسا ہے بلکہ اس لیے کہ دونوں فریق ایک مدت سے اسی حالت پر قائم ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق کامیاب ہیں۔ اس لئے ان کو اعلانیہ نظر آتا ہے کہ اصلاح کی ضرورت نہیں۔ تاہم جدید گروہ بہ آسانی اپنے خلاف نکتہ چینی سننے پر آمادہ ہوسکتا ہے؟ اس لئے پہلے ہم انھیں سے خطاب کرتے ہیں۔

اس قدر مسلم ہونے کے بعد کہ تعلیم جدید کے ساتھ کسی قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے۔ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس ضرورت کی مقدار کیا ہے اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ، افتا کا کام لینا نہیں ہے، بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بہ قدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں۔ اس کے لیے صرف ایک مختصر اور جامع و مانع سلسلۂ کتب دینیات کی ضرورت ہے۔ جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے کالج کلاسوں تک کی قابل ذکر کتابیں ہوں۔ اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں۔ فقہ، عقائد، تاریخ اسلام، فقہ اور تاریخ کے متعلق مصر میں عمدہ کتابیں تیار ہوگئی ہیں۔ ان کا ترجمہ کافی ہوگا۔ عقائد کی نسبت البتہ مشکل ہے، کیوں کہ ہندستان میں، جو کتابیں آج کل لکھی گئی ہیں ان پر ابھی تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہوسکتا اور مصر وغیرہ کی جدید تصانیف ناکافی اور ناقابلِ درس ہیں۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ اسکول کلاسوں میں صرف فقہ اور تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات خود عربی ہی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہوسکتا۔ بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چاروں طرف، مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے۔ دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے۔ مذہبی علماء بیش قرار مشاہرہ کے مقرر کیے جائیں۔ وعظ کے موقعوں پر اکثر ارکانِ کالج تا امکان شریک ہوں، مذہبی پابندی کی بنا پر طلبہ کی خاص توقیر اور تحسین کی جائے اور سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبہ کو گراں بہا وظائف دے کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ درجہ کی مذہبی تعلیم دلائی جائے۔

یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم میں سخت اصلاح اور اضافہ کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں۔ اس لیے ہم ان سے سوالاتِ ذیل کے جواب چاہتے ہیں:

۱۔ یورپ کے مصنفین، مذہب پر جو حملہ کر رہے ہیں، اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟
۲۔ اگر علما خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے؟
۳۔ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں۔ ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟
۴۔ علما جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے، جواب کیوں کر دے سکیں گے؟
۵۔ کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیئے تھے؟
۶۔ اگر اس وقت اس زمانے کے فلسفہ کا سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں ہے؟

ان سوالات کا اگرچہ خود بخود یہ جواب ہوگا کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم ان علما کو جو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں خیال کرتے اصلاح پر مجبور کریں۔ اس کی وجہ ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکامِ اسلام کا پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے جس کے لیے سیکڑوں ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مساجد کی امامت اور فتویٰ وغیرہ بہت سے کام ہیں جو محض خالص قدیم تعلیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے تقسیم عمل کی رو سے یہ کام اس گروہ کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں اور ہر طرح پر ان کی تائید و اعانت اور احترام کرنا چاہیے۔ اس نقطۂ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بیکار بتاتے ہیں۔ وہ بھی تسلیم کرلیں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے۔ صرف ہم کو اس کا استعمال صحیح طور سے کرنا چاہیے۔ البتہ اس قسم کے قدیم مدرسوں میں اس قسم کی تربیت پر اصرار کرنا چاہیے جس سے تعصب، سخت دلی تنگ خیالی نہ پیدا ہو جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پرانے مولوی اور جدید تعلیم یافتہ ایک صحبت میں بسر نہیں کر سکتے اور ہر موقع پر دونوں دو حریف کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو دربار نبوی کا نمونہ پیش نظر رکھنا چاہیے جہاں کافروں اور منافقوں تک کو بار ملتا تھا اور ان کی بھی خاطر داری کی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تو ان کو حکم ہوا کہ قولا لہ قولا لینا یعنی

فرعون سے نرمی سے بات کرنا۔

دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اجزا ہیں۔ اس لیے دونوں کو آپس میں دست و بازو ہو کر کام کرنا چاہیے۔

لیکن علما کے جس گروہ نے جدید ضرورتوں کا اندازہ کیا ہے اور اس کے موافق عربی تعلیم میں اصلاح و اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان اصول کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہیں جو ندوہ نے اختیار کیا ہے اور جو عملی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اگر قوم ان واقعات کو پیش نظر رکھے تو آج کل قوم کی کوششوں کی پراگندگی کا جو اعتراض ہے وہ اٹھ جائے اور لوگ اطمینان اور سکون اور بے تعصبی کے ساتھ اپنی اپنی حدود میں محدود رہ کر اپنے کاموں کو انجام دیں۔

لفظ و معنی

جنبش	۔	حرکت
حریف	۔	مخالف
مجوزہ نقشہ	۔	تجویز کیا ہوا نقشہ
اعتراضات	۔	اعتراض کی جمع
تصانیف	۔	تصنیف کی جمع

آپ نے پڑھا

- مولانا شبلی نے تعلیم کے قدیم اور جدید تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں کے فوائد پر تفصیل سے اور مثالوں کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔
- مولانا کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے قدیم تعلیم کے ساتھ جدید طرز کی تعلیم سے بھی واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے مذہب سے بھی آگاہ رہیں اور بدلتے ہوئے رجحانات پر بھی ان کی نظر رہے۔
- مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ مدرسوں میں اس طرح کی تعلیم دی جانی چاہیے جس سے تعصب اور تنگ خیالی پیدا نہ ہو۔

آپ بتایئے

1. علامہ شبلی کہاں پیدا ہوئے؟

2. ان کی کسی ایک تصنیف کا نام بتائیے۔

3. علامہ شبلی کیا کبھی انجمن ترقی اردو کے صدر بھی تھے؟

4. کیا علامہ شبلی ندوۃ العلما میں بھی رہے؟

5. دارالمصنفین کو کس نے قائم کیا؟

مختصر گفتگو

1. جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

2. قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

3. دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟

4. کیا ان دونوں میں ٹکراؤ ہے؟

5. علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب کب ملا؟

تفصیلی گفتگو

1. تعلیم قدیم و جدید سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

2. علامہ شبلی نے دونوں طرح کی تعلیم کے دائرہ کار کو کس طرح متعین کیا ہے؟

3. علامہ شبلی نے قدیم و جدید تعلیم میں اصلاح کی کیا تجویزیں پیش کی ہیں؟

4. ایک مضمون لکھ کر علامہ شبلی کے خیالات و کارناموں کو واضح کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. علامہ شبلی کی کوئی ایک تصنیف جو آپ کو پسند ہو اپنے سامنے رکھ کر اس کے اہم نکات لکھیے۔

2. تعلیم قدیم و جدید کے مضمون سے جو پیغام ملتا ہے، اس کو عام کرنے کی کوشش کیجیے۔

3. اس فکر کو عام کیجیے کہ تعلیم قدیم و جدید دونوں فائدہ مند ہے اور اسے حاصل کرنا چاہیے۔

ترجمہ نگاری

اردو ادب کے مجموعی ارتقاء میں ترجمہ نگاری کا اہم کردار رہا ہے۔ چنانچہ اردو افسانہ، ڈراما اور آزاد نظم کے ارتقا میں بھی تراجم نے اہم رول ادا کیا ہے۔ بہتر ترجمہ کرنے کے لیے اصل تخلیق کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ تاہم اس سلسلے میں شاعری اور انشائیہ کے مقابلے میں افسانہ اور ڈرامہ کا ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے۔

اردو ادب میں غیر ملکی ادب کے تراجم کی کہانی بہت قدیم ہے۔ خاص طور سے فورٹ ولیم کالج کا رول ترجمہ کے معاملے میں تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ پھر بیسویں صدی میں انگریزی، روسی اور ترکی ادبیات سے بھی اردو میں ترجمہ کرنے کی روایت کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں جیسے بنگلہ، مراٹھی، گجراتی اور پنجابی وغیرہ سے بھی اردو میں ترجمہ کیا جانے لگا جس سے دوہری سطح پر ترجمہ کا رجحان بڑھتا چلا گیا۔ مغربی ادبیات کے تراجم کی وجہ سے ہمارے اردو افسانہ کے سرمائے میں کافی اضافہ ہوا۔

ترجمے کی عموماً دو صورتیں ہوتی ہیں۔ اولاً آزاد ترجمہ، دوسرے لفظی یا با محاورہ ترجمہ۔ آزاد ترجمہ کے مقابلے لفظی ترجمہ زیادہ کارآمد اور اصل تخلیق کی ترسیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک ملک کی زبان میں لکھی گئی کسی تخلیق کو کسی دوسرے ملک کی زبان میں ترجمہ کرنا ایک دشوار کام ہے کیونکہ تخلیق کا رشتہ اپنی زبان سے بہت مضبوط ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اچھے سے اچھا ترجمہ بھی صد فی صد کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اندر جیت لال

مغربی انشائیے

لفظ ایسے (Essay) فرانسیسی لفظ اسائی (Essai) سے انگریزی زبان میں آیا۔ اس کا لغوی مفہوم ہے 'کوشش'۔ انشائیہ انگریزی زبان میں ایک قابل قدر صنف ادب ہے اس میں مقالہ یا مفہوم کی صورت میں شخصی تاثرات، جذبات یا فلسفیانہ وحکیمانہ تفکرات کو پیش کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے پرسنل ایسے (Essay) یا ایک نازک صنف مانا جاتا ہے۔

انگریزی میں انشائیہ فرانسیسی زبان سے آیا ہے۔ کہتے ہیں سولہویں صدی میں ایک فرانسیسی ادیب مائیکل ڈی مونٹین نے اس فن ادب کی داغ بیل رکھی۔ اُن دنوں انشائیہ کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ پرانے روم اور یونان کی عالی مرتبہ شخصیات کی زندگیوں کے کسی پہلو یا گوشہ پر اس طرز سے لکھا جاتا کہ اس سے کچھ نہ کچھ اخلاقی درس حاصل ہو۔ اُن دنوں کے انشائیوں میں مثبت قدروں یعنی دانائی، ایمانداری، بہادری کو نفس مضمون بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں مونٹین نے روایتی طرز پر کچھ انشائیے لکھے۔ لیکن بعد میں اس نے اپنی تحریر میں خاصی آزادی حاصل کرلی۔ کہتے ہیں مونٹین جو کچھ اپنے ماحول میں دیکھتا یا جس موضوع پر غور وخوض کرتا، اس پر آزادی سے مقالے لکھتا۔ اس نے مختلف موضوعات پر ہلکے پھلکے اور فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات کو ایک باربط اور ایک ادبی زبان میں پیش کیا۔ مونٹین نے اپنے انشائیوں کے نقش اول پر یوں لکھا ہے:

'میں نے ان انشائیوں میں اپنے آپ کو منعکس کیا ہے۔'

مونٹین کے زمانہ سے پہلے انگریزی میں انشائیے نام کی کوئی صنف موجود نہ تھی۔ چنانچہ جان فلوریو (John Florio) نے پہلی بار فرانسیسی انشائیوں کے ترجمے کر کے انگریزی داں طبقے کو روشناس کرایا۔

سترہویں صدی میں فرانسیسی بیکن (1561-1626ء) نے انگریزی زبان میں اٹھاون انشائیے 1597ء سے 1625ء کے درمیان لکھے۔ آج بھی ان انشائیوں کو انگریزی ادب میں بلند مقام حاصل ہے بلکہ ان میں چند انشائیے تو ادبی شہ پارے بن چکے ہیں۔ بیکن کے انشائیوں میں غزل کے اشعار کی طرح زور بیان، اختصار اور محاورہ

کا بیان ہے۔ کئی جملے تو ضرب المثل معلوم ہوتے ہیں۔ ان انشائیوں میں تنقید حیات ہے۔ کچھ تکلف اور غور وفکر کی گہرائی بھی ان میں فلسفیانہ عنصر بھی ہے اور کچھ رومانیت بھی۔ بیکن کے الفاظ میں انشائیہ ایسی مختصر تحریر ہے جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے کسی حقیقت کا اظہار ہو جائے۔ بیکن کے ایک انشائیے 'آف اسٹڈیز' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

'مطالعہ خوشی بکھیرتا ہے۔ یہ شخصیت میں آرائش کا سامان بنتا ہے اور قابلیت بڑھاتا ہے اگر آپ فراغت میں ہوں تو خوشی آپ کے دامن میں رہے گی۔ گفتگو میں مطالعہ سے حاصل کی ہوئی قابلیت آپ کے فیصلوں اور کاروباری مسائل میں آپ کی معاون ہوگی۔'

اسی انشائیے میں آگے چل کر فرماتے ہیں :

'کئی کتابوں کا محض ذائقہ لینا ہی کافی ہے۔ کئی کتابوں کو خوب نگلنا ہوتا ہے اور کچھ کو خوب چبا کر کھانا اور ہضم کرنا ضروری ہے۔ مطالعہ ایک انسان کو انسان سے مکمل انسان بنا دیتا ہے۔ گفتگو سے انسان کا ادراک کچھ قوی ہو جاتا ہے اور تحریر سے انسان ایک متوازی انسان بن جاتا ہے۔'

اس صدی میں ایک انشائیہ نگار جان ارل اور اس کے ایک معاصر ٹامس اوور بری نے اپنے دور کی عورتوں، مردوں کے کرداروں کا اپنے انشائیوں میں تجزیہ کیا ہے۔ ان دونوں ادیبوں نے ڈیری فارم میں کام کرنے والی عورتوں سے لے کر بلند مرتبہ سیاست دانوں تک کی کردار نگاری کی اور انسانی فطرت کے گونا گوں پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ جان ارل کا انشائیہ مائیکرو کاسموگرافی طنز و مزاح کا ایک نادر نمونہ ہے۔

سر رچرڈ اسٹیل ایک خالص ادبی فہم و فکر کا مالک تھا۔ اس نے کئی نظمیں، کامیڈیاں اور سیاسی اور صحافتی نگارشات پر طبع آزمائی کی لیکن اس نے سب سے زیادہ نام The Tatler نام کے رسالے سے پیدا کیا۔ اس ادبی کام میں ایڈیسن اس کا قابل قدر رفیق و معاون رہا۔

ان رسائل میں رموز حیات پر فلسفیانہ رنگ میں افکار پریشاں شائع ہوتے تھے۔ ان دنوں صرف لندن میں ہی لگ بھگ ساٹھ اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ جن میں ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر انشائیے شائع

ہوتے تھے۔ان اخبارات اور رسائل نے انشائیوں کو ایک ہر دل عزیز صنف بنادیا۔اسٹیل (Steel) اخلاقی اوصاف اور انسانی صفات کو انسان کی سرشت میں داخل کرنا چاہتا تھا۔اس کی نگاہ اپنے وقت کے معاشرے کی خرابیوں اور بے اعتدالیوں کی طرف اٹھتی رہی اور اس کے انشائیوں کا مواد فراہم کرتی رہی۔

اٹھارہویں صدی کے انشائیہ نگاروں پر آلیور گولڈ اسمتھ کا نام ممتاز ہے۔اس کے انشائیوں میں ایک ہلکا سا مزاح جھلکتا ہے۔زبان کی چاشنی اور خیالات کی تازگی اس کے انشائیوں کی جان ہے۔سیموئیل جانسن کے انشائیوں میں تکلف کو بڑا دخل حاصل ہے۔اس کا اسٹائیل بھی ایک حد تک لاطینی رہا۔جانسن کبھی کبھار انشائیے لکھتا تھا۔اس کے انشائیے 'تنہائی کے حق میں' اور 'اچھا مزاح' اس کے شاہکار کہے جاسکتے ہیں۔

چارلس لیمب (Chales lamb) کو انگریزی انشائیوں کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ان میں اس کا نرم ولطیف دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔لیمب زیادہ تر اپنی زندگی سے ابھرتے موضوعات پر انشاپردازی کرتے ہیں۔ایلیا کا انشائیہ اس کی سوانح حیات کا مظہر ہے۔اس کے انشائیوں میں دانش وری، فلسفہ اور انسانیت کا عنصر ہے۔کہیں کہیں لیمب سترہویں صدی کے انشائیہ نگاروں کی یاد دلاتا ہے۔چارلس لیمب نے انگریزی انشائیوں میں لطافت بیان اور حیات وکائنات پر بھرپور تنقید کی ہے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں جان رسکن اور ٹامس کارلائل نے کچھ انشائیے لکھے۔رسکن کے انشائیوں میں فطرت سے لگاؤ، خلوص، سادگی اور بیان کی دل کشی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ان کا ایک انشائیہ 'گھاس کا ایک پات' بین الاقوامی شہرت کا درجہ لے پایا۔یہ پات ایک زرد رنگ کا اندر سے کھوکھلا ڈنٹھل ہوتا ہے۔اس کے باوجود اس کے بارے میں سوچیں، اور فیصلہ کریں کہ وہ تمام چمکدار پھول جو موسم گرما کی فضا میں دہکتے ہیں اور وہ تمام تنومند اور خوش اندام شجر جو آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔مثلاً سروقد پام اور صنوبر اور شاہ بلوط خوشبودار گلگل اور لدی پھندی انگور کی بیل۔کیا ان میں کوئی ایسا بھی ہے جس سے انسان نے اتنی محبت اور خدا نے جس کی اتنی قدر کی ہو جس گھاس کے پات کی۔میتھو آرنلڈ (Methew Arnald) نے تنقیدی انشائیے لکھے، جن میں استدلال اور جدت غالب ہے۔اس کے انشائیے اختصار اور جامعیت کے بہترین نمونے ہیں۔

ایک ہم عصر ناول نگار نے کسی بدیشی سے ایک بار یہ سوال کیا تھا کہ انگلستان کی اہم ترین فصلیں کون سی ہیں تو اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جواب دیا تھا 'رائی' جہالت اتنی مکمل تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے عظمت کو

چھولیا ہو لیکن جاہل آدمی کی لاعلمی تو اس سے کہیں افزوں ہوتی ہے۔ ایک اوسط ذہن کا آدمی جو ٹیلی فون کو استعمال کرتا ہے اس بات کی وضاحت نہیں کرسکتا کہ ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے۔ وہ ٹیلی فون کو بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ وہ انجیل مقدس کے معجزوں کو بغیر کسی ثبوت کے بہ رضا و رغبت مان لیتا ہے۔ وہ نہ اس کے بارے میں استفسار کرتا ہے اور نہ ہی اس کے سلسلے میں سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔

موجودہ دور میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جو نوبل انعام یافتہ اور جدید شاعری و تنقید کے بادشاہ کہلاتے ہیں۔ چند ادبی و تنقیدی انشائیوں کے مصنف بھی ہیں۔ ایک انشائیے روایت اور انفرادی ملکہ میں فرماتے ہیں:

'شاعری جذبات کا اظہار نہیں بلکہ جذبات سے فرار ہے۔ یہ شخصیت کا اظہار بھی نہیں بلکہ شخصیت سے فرار ہے۔'

ایلیٹ نے مزید انشائیے عہد الزابیتھ کے ڈرامہ نگاروں (جانسن و ملڈلیٹن) پر لکھے۔ کچھ انشائیے 'کلاسیکی کیا ہے؟'، 'مذہب اور ادب'، 'تجربہ اور تنقید'، 'تنقید کی حدود' اور 'شاعری کا سماجی منصب' قابل ذکر ہیں۔ ایلیٹ نے انشائیوں کے ذریعہ انگریزی ادب کے قدروں کو نئی تراکیب و اہمیت کے ساتھ متعین کیا ہے اور انگریزی ادب کا یوروپی اقدار۔ آج کا انشائیہ نگار کوئی نئی بات کہنے کا عادی ہی نہیں رہا۔ پرانی باتوں اور مطبوعہ خیالات و تاثرات کو توڑ مروڑ کر پیش کر پاتا ہے بلکہ کہی ہوئی باتیں دہراتا ہے۔ بلکہ دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی بات کو مختلف انشائیہ نگاروں نے مختلف اسٹائل سے ادا کیا ہے۔ اسے انشائیہ نگاری نہیں کہتے۔ پروکٹر، لی ہنٹ، چارلس لیمب اسی قماش کے انشائیہ نگار کہے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر لیمب مردے کی ارتھی پر بھی مزاح نگاری پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اس طرح وہ انشائیہ نگاری سے کوسوں دور چلا جاتا تھا۔

'انشائیہ نگاری ایک بانس پر پھول مالائیں سجا کر رقص کرنے کا کام نہیں۔ پوری محنت کا طلب گار ہوتا ہے۔ ساتوں دن اور چوبیس گھنٹے انشائیہ نگار سرنگوں کر کے اور بغیر ستائے لکھتا رہے تو بات بنتی ہے۔ قلم برداشتہ لکھے یا اِدھر اُدھر کی ہانکنے کو انشائیہ نگاری نہیں کہتے۔ یہ کالم سنجیدگی، گہری سوچ اور متانت کا متقاضی ہوتا ہے۔'

یہ ایک سنجیدہ انشائیہ نگار کی رائے ہے جو ہر فرد و بشر کو قابل قبول ہوگی۔

الفاظ و معنی

لغوی ۔ لغت سے متعلق

مفہوم ۔ مطلب

صنف ۔ قسم (جو ادب کی قسموں کے لیے عموماً بولا جاتا ہے)

تاثر ۔ اثر قبول کرنا

حکیمانہ ۔ حکمت سے بھری ہوئی

پرسنل ۔ ذاتی

انشائیہ نگار ۔ انشائیہ لکھنے والا

فلسفی ۔ فلسفہ کا علم رکھنے والا

نقاد ۔ تنقید کرنے والا

مقالہ نگار ۔ مقالہ لکھنے والا

اسلوب ۔ لکھنے کا طرز

طویل ۔ لمبا

لب ولہجہ ۔ انداز، لکھنے کا طریقہ

سبک ۔ ہلکا

جذباتی ۔ جذبات سے بھرا ہوا

طنزیہ ۔ طنز سے بھرا ہوا

رمزیہ ۔ رمز سے بھرا ہوا

دانائی ۔ عقل و دانش

تنقید ۔ کھرے کھوٹے کی پرکھ

عنصر ۔ حصہ

آرائش ۔ سجاوٹ

معاون ۔ مددگار

محض - صرف

ہضم کرنا - پچانا

ادراک - سمجھ

قوی - طاقت ور

متوازی - برابر میں، مقابلے میں

صدی - سو سال کی مدت

فہم - سمجھ

آپ نے پڑھا

- انشائیہ ایک نثری صنف ہے جس میں طنز و مزاح کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔
- اردو میں انشائیہ انگریزی انشائیہ کے حوالے سے داخل ہوا۔
- دیگر اصناف نثر کی طرح انشائیہ نسبتاً جدید صنف ہے۔
- زیر نصاب مضمون میں اندر جیت لال نے مغربی انشائیوں پر تنقید کی ہے۔
- سلیم آغا قزلباش نے اس تنقیدی مضمون کو اردو کا جامہ پہنایا ہے جس کی مدد سے اردو انشائیوں کے خدو خال متعین کرنا آسان ہے۔

آپ بتائیے

1. زیر نصاب مضمون 'مغربی انشائیے' کس قسم کا مضمون ہے؟
2. مضمون 'مغربی انشائیے' کے اصل مضمون نگار کون ہیں؟
3. 'مغربی انشائیے' مضمون کا ترجمہ کس نے کیا؟

مختصر گفتگو

1. تنقید کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
2. اردو انشائیہ کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
3. ترجمہ نگاری کے فن کو مختصراً بیان کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1. ترجمہ نگاری کے موضوع پر ایک مضمون لکھیے۔
2. صنف انشائیہ پر روشنی ڈالیے۔
3. 'مغربی انشائیے' کا جائزہ لیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. کلاس میں اردو اساتذہ سے انشائیہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے۔
2. کسی لائبریری میں جاکر اردو ترجمہ نگاروں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

سفرنامہ

عام بول چال کی زبان میں سفر کے حالات کو تحریری شکل میں لکھنے کو سفرنامہ کہتے ہیں۔ سفرنامے کا شمار اردو نثر کے غیر افسانوی صنف میں ہوتا ہے۔ اردو نثر میں سفرنامے کی روایت خاصی قدیم بھی ہے۔ انسان فطری طور پر تغیر پسند واقع ہوا ہے۔ وہ یکسانیت سے اوب جاتا ہے۔ نئی باتیں اور نئی چیزیں دیکھنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی فطرت انسان کو سفر کی طرف مائل کرتی ہے۔

اگر سفر کرنے والا شخص ذوق لطیف کا مالک ہو تو پھر وہ سفر کے حالات و واقعات کو ضبط تحریر میں بھی لے آتا ہے جسے ہم ادب کی زبان میں سفرنامہ کہتے ہیں۔

فنی لحاظ سے سفرنامے کا کوئی اسلوب یا تکنیک ابھی تک وضع نہیں کیا گیا ہے۔ یہ سفرنامہ نگار کی تخلیقی صلاحیت اور ادبی ذوق پر منحصر ہے کہ وہ سفرنامہ کے لیے کون سی ہیئت اور اسلوب متعین کرتا ہے۔ یعنی فن کے معاملے میں سفرنامہ نگار بہت حد تک آزاد ہوتا ہے۔ وہ جس اسلوب میں چاہے سفرنامہ تحریر کرے۔ وہ سفرنامہ لکھنے کے دوران اس بات کا خیال رکھے کہ سفرنامہ، سفرنامہ رہے، داستان یا ناول یا افسانہ نہ بن جائے۔ اس میں پراسراریت اور دلچسپی بڑھانے کے لیے غیر ضروری رنگین بیانی، کہانی پن یا واقعہ میں مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اردو نثر کے سرمایے میں سفرناموں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔

SOLUTIONS
ABSOL
PATNA

ابن انشا

ابن انشا کا اصل نام شیر محمد خان تھا۔ اردو ادب کی دنیا میں ابن انشا کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابن انشا کی پیدائش ہندوستانی پنجاب کے ضلع جالندھر کے ایک گاؤں میں ایک کاشتکار خاندان میں 1927ء میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام منشی خان تھا جو پھلور گاؤں کے بڑے کاشتکار تھے۔ ابن انشا کی والدہ بی بی مریم ایک گھریلو اور دین دار خاتون تھیں۔

ابن انشا نے اپنے گاؤں کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر 15 سال کی عمر میں اپرہ ہائی اسکول سے 1942ء میں میٹرک پاس کیا۔ مادری زبان اردو تھی لیکن فارسی زبان سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انشا نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ شاعری میں ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک شاعر ہونے کے علاوہ ابن انشا ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ اردو نثر میں ان کا ایک ضخیم سفرنامہ شائع ہو کر اہل علم سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔

والدہ کی شدید خواہش پر 1942ء میں ابن انشا کی شادی ایک شہری لڑکی عزیزہ بی بی سے ہوئی۔ شادی کے بعد ابن انشا تلاش معاش اور مزید تعلیم کی غرض سے لاہور چلے گئے۔ جہاں ان کو علماء، شعرا اور ادباء کا وسیع ماحول میسر ہوا جو ان کی شخصیت میں نکھار اور باضابطہ ادبی زندگی کے آغاز کا باعث ہوا۔ قیام لاہور کے دوران ابن انشا کی ملاقات غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مولانا صلاح الدین اور مشہور شاعر حفیظ جالندھری جیسی شخصیات سے رہی جن کی صحبتوں نے ابن انشا کی زندگی میں مزید نکھار پیدا کیا۔ اس زمانے میں ابن انشا کالج میں پڑھتے بھی تھے اور اخبار 'نوائے وقت' میں جز وقتی کام بھی کرتے تھے۔ اس طرح گردش حالات کا شکار ہو کر ابن انشا لاہور سے واپس آ گئے اور انبالہ چھاؤنی میں ملٹری اکاؤنٹس کے شعبے میں جونیئر کلرک کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ اور ترقی کر کے کراچی میں نیشنل بک کاؤنسل کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ملازمت کے دوران بھی ابن انشا نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا اور ادبی مشاغل یعنی لکھنے پڑھنے میں بھی مصروف رہے یہاں تک کہ ایک سفرنامہ نگار کی حیثیت سے اپنی ایک مستقل شناخت قائم کی۔

1977ء میں ابن انشا ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ علاج کے لیے لندن لے جایا گیا لیکن افاقہ نہ ہوا اور 2 رجنوری 1978ء کو لندن میں ہی انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

فلپائن کا سفر۔ ۱۹۶۷ء

اگر کسی مسافر کی کوئی نقدی یا کوئی اور قیمتی چیز یا دستاویزات وغیرہ ہوٹل کے کمرے سے گم ہو جائیں تو ہوٹل ھٰذا قطعی ذمہ دار نہ ہوگا۔ مہمانانِ عزیز کو خبردار کیا جاتا ہے کہ خواہ چند لمحے کے لیے بھی کمرے سے باہر جائیں کمرے میں کوئی قیمتی چیز نہ چھوڑیں اور دروازہ مقفل کر کے باہر نکلیں۔ رات کو کمرے میں سوتے وقت دروازے کی دوہری چٹخنیاں بھی ضرور چڑھا لیں۔

ہوٹل ھٰذا کسی مسافر کے کمرے میں صنفِ مخالف کے کسی رکن کا آنا مستحسن نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی معزز مہمان کمرے کے بیرے یا ہوٹل کے اسٹاف کے کسی اور رکن سے مل ملا کر کچھ کر لے تو ہوٹل خود کو بری الذمہ سمجھے گا۔

"ہم اپنے مہمان عزیز کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ایسی خدمت کریں گے کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا" یہ اس ہوٹل کے کمرے میں لٹکے ہوئے نوٹس کی نقل مطابق اصل ہے ہر چند کہ یہ ہوٹل یہاں کے قابلِ اعتبار ترین اور معزز ہوٹلوں میں گنا جاتا ہے تاہم مہمان کے جان و مال کی سلامتی کی گارنٹی دینا دور اندیشی کے خلاف سمجھتا ہے۔ لہٰذا اس وقت بھی جب کہ رات کے گیارہ بجے ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں کمرے کی نہ صرف دونوں چٹخنیاں لگی ہوئی ہیں بلکہ ہم نے لکھنے کی میز دروازے سے بھڑا کر اپنا سوٹ کیس اس پر رکھ دیا ہے۔ شام کے جھٹ پٹے کے وقت کھڑکی کے پیچھے ایک چہرہ نظر آیا تھا۔ ہم نے کھڑکی کھول کر موصوف سے کہا کہ اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج؟ بولا "آپ کی کھڑکی کے شیشے صاف کرنا چاہتا تھا۔" ہم نے کہا۔ "کر لو۔ لیکن صرف شیشے صاف کرنا۔ بولا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ پھر کسی وقت آ کر کر لوں گا۔ روم بوائے سے ہم نے نو بجے ہی کہہ دیا تھا کہ کھانا کھا چکے، چائے ہم پی چکے۔ اب ہم آرام کریں گے۔ تم بھی آرام کرو۔ پھر بھی دو بار دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھ چکا ہے کہ اور کوئی خدمت؟ سوچنے کی بات ہے کہ منیلا ہوٹل والے غریب الوطن مسافروں کے آرام و آسائش کے بارے میں کتنے فکر مند رہتے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔ کابل کے ہوٹل روم کا بوائے تو ایسا استغنا کا مارا ہوا تھا کہ آواز دینے پر بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے پوچھ لیا تھا کہ صاحب کب اور کس روز جائیے گا۔ بس اس روز وقت نکال کر

بخشش لینے ضرور آ گیا۔

جب بھی ہم کہیں کا سفر اختیار کرتے ہیں لوگ طرح طرح کے بہانوں سے ہمیں باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کابل کے معاملے میں ہمیں سردی سے ڈرایا گیا تھا۔ منیلا کے بارے میں سردی کا عذر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ یہاں بارہ مہینے گرمی رہتی ہے۔ لہذا چوری چکاری کا ذکر لے بیٹھے۔ کراچی میں ہمارے ایک جرمن دوست ہیں، اکثر سفر کرتے رہتے ہیں، ہم نے ان سے آشیرواد چاہی تو بولے: 'منیلا۔۔۔؟ میاں اخبار پڑھا ہے؟ اس وقت جرائم کے معاملے میں سب سے آگے نکلا ہوا ہے۔ سائیگون اور نیو یارک سے بھی۔'

'جی پڑھا ہے۔'

'پھر مت جاؤ۔'

'جانا ضروری ہے۔'

'وہاں چوری ضرور ہوتی ہے۔ جیب ضرور کٹتی ہے۔ اپنے ساتھ کوئی رقم وقم لے کر مت جانا۔'

'جی اچھا۔'

'ٹیکسی والے بہت بدمعاش ہیں۔ ایرپورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھو تو راستے میں گھما کر ہوٹل کی بجائے کسی ویران علاقے میں لے جاتے ہیں۔ مسافر کو اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں اور سوٹ کیس لے کر غائب ہو جاتے ہیں۔ لہذا اپنے ساتھ سوٹ کیس لے کر نہ جانا۔'

'جی بہت مناسب۔'

'میرے ایک دوست کے تو انھوں نے کپڑے بھی اتار لیے تھے۔'

'تو کیا کپڑے بھی نہ پہن کر جاؤں۔'

بولے۔ 'یہ میں نہیں کہتا۔ ہاں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ وہاں کسی کی آبرو محفوظ نہیں۔ اقوام متحدہ کے دفتر کی ایک میم صاحب وہاں تنہا گئی تھیں......'

ہم نے کہا۔ 'جس قسم کی آبرو کا آپ حوالے دے رہے ہیں۔ اس کا ہمارے معاملے پر اطلاق نہیں ہوتا۔'

مصر ہو کر کہنے لگے۔ 'میں پھر کہتا ہوں کہ مت جاؤ۔'

'ضرور جائیں گے۔' ہم نے کہا۔ ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ فرنگی آدمی ہے۔ یہ نہیں چاہتا کہ کسی ایشائی سے شیر و شکر

ہوں، کسی قسم کا تعلق قائم کریں جائز اور ناجائز کی بحث تو بعد میں آتی ہے۔'

یہ اچھا ہے کہ میرے فلپائنی دوست بنی بابو کو میرا خط مل گیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی فرلانگ بھر لمبی کار سے لے کر ہمیں لینے منیلا ایر پورٹ پر آئے ہوئے تھے۔ ایک اور بزرگ بھی ایک بین الاقوامی ادارے کی طرف سے ہماری پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ یہ قوم کے بھارتی تھے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بولے۔'تو اچھا اپنے دوست کے ساتھ جا رہے ہیں آپ، ٹھیک ہے۔ فلاں ہوٹل میں آپ کا بندوبست ہے، تھوڑا مہنگا ہے لیکن نسبتاً محفوظ ہے۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اقوام متحدہ کے کام سے آئے ہیں۔ تھوڑی سی رعایت بھی شاید کر دیں۔'

لفظ و معنی

مقفل	۔	تالا لگا ہوا
صنف	۔	قسم
رکن	۔	ممبر
مستحسن	۔	اچھا
معزز	۔	عزت والا
بری الذمہ	۔	ذمہ داری سے آزاد ہونا
قابل اعتبار	۔	بھروسہ کے قابل
تاہم	۔	پھر بھی
دور اندیشی	۔	دور تک سوچنا
موصوف	۔	جس کی صفت بیان کی گئی ہو
روم بوائے	۔	ہوٹل کا خدمت گار
غریب الوطن	۔	اپنے وطن سے دور رہنے والا
جزائے خیر	۔	اچھا بدلہ
استغنا	۔	بے نیازی
قباحت	۔	پریشانی
اطلاق ہونا	۔	لاگو ہونا
مصر ہونا	۔	بضد ہونا

ABSOL SOLUTIONS ABSOL * PATNA *

شیر و شکر ہونا - مل جل کر رہنا

آپ نے پڑھا

- ابن انشا نے منیلا (فلپائن) کا جو سفر نامہ لکھا ہے اس کا ایک حصہ آپ نے گزشتہ صفحات میں پڑھا۔ انشا نے بتایا کہ کس طرح لوگوں نے انہیں اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی اور وہاں کے خطرات سے آگاہ کیا۔ جب کہ ایسی کوئی خاص بات نہ تھی۔ تھوڑا بہت سلامتی کا مسئلہ تو ہر نئے ملک میں سیاح کے لیے ہوتا ہی ہے۔

آپ بتائیے

1. ابن انشا کی پیدائش کب ہوئی؟
2. ابن انشا کا تعلق کس صنف ادب سے ہے؟
3. زیر نصاب مضمون کے قلم کار کون ہیں؟
4. ابن انشا کا اصل نام کیا ہے؟
5. فلپائن کی راجدھانی کہاں ہے؟

مختصر گفتگو

1. سفر نامہ کی مختصر تعریف بیان کیجیے۔
2. ابن انشا کی مختصر سوانح بیان کیجیے۔
3. منیلا کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

1. ابن انشا کے سفر ناموں کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
2. زیر نصاب سفر نامہ کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے اردو سفر ناموں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔
2. گلوب کو سامنے رکھ کر فلپائن کے جغرافیائی حالات معلوم کیجیے۔

خودنوشت

خودنوشت سوانح حیات (Auto biography) سے مراد کسی شخص کے اپنی زندگی سے متعلق خود لکھے ہوئے حالات ہوتے ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات میں مصنف اپنی تصویر خود بناتا ہے۔ انسانی تقاضے کے تحت اس کا غیر ارادی مطمح نظر یہی ہوتا ہے کہ لوگ اسے پہچانیں۔ خودنوشت سوانح حیات میں عجز اور انکسار کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دیے جائیں، تکلفات کے پے در پے حلقے کھینچ دیے جائیں لیکن ہر شخص کا سب سے بڑا ہیرو وہ خود ہوتا ہے۔ خالصتاً لفظی اعتبار سے خودنوشت سوانح میں اپنی کہانی خود لکھنے کی شرط ہے۔

آپ بیتی (خودنوشت سوانح حیات) کے لیے صفحات کی یا کوئی خاص طریقہ کار کی قید نہیں۔ یہ چند سطروں پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے اور سینکڑوں صفحات پر بھی محیط ہوسکتا ہے۔ البتہ آپ بیتی عام طور پر نثر میں اپنے حالات کا لکھنا ہے۔

آپ بیتی کے لیے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں۔ تاہم تین شرطوں کی امتیاز لازمی ہے:

۱۔ سچائی، ۲۔ شخصیت، ۳۔ فن

اردو میں بہت ساری خودنوشت سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں جن میں 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی' (شاد عظیم آبادی)، سحر ہونے تک (آغا حشر کاشمیری)، یادوں کی برات (جوش)، اپنی تلاش میں (کلیم الدین احمد)، غبار کارواں (انیس قدوائی)، قصہ بے سمت زندگی کا (وہاب اشرفی) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بیگم انیس قدوائی

بیگم انیس قدوائی کی پیدائش تقریباً 1905ء میں بارہ بنکی (یو۔پی) کے مشہور قدوائی خاندان میں ہوئی۔ قدوائی خاندان کا موروثی تعلق قاضی قدوۃ الدین سے تھا جو مکہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ انیس قدوائی کے والد ولایت علی بارہ بنکی شہر کے مشہور وکیل تھے۔ اس تعلیم یافتہ ماحول میں بھی لڑکیوں کے پردے کا سخت اہتمام کیا جاتا تھا اور گھریلو تعلیم و ابتدائی دینیات سے آگے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کے لیے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انیس قدوائی نے پردے میں ہی صرف گھریلو تعلیم یعنی مروجہ مذہبی کتابیں، دینیات اور اردو فارسی تک تعلیم حاصل کر سکیں۔ انیس قدوائی کی شادی مشہور کانگریس رہنما اور وزیر رفیع احمد قدوائی کے چھوٹے بھائی شفیع احمد قدوائی سے ہوئی۔ انیس قدوائی کی ایک صاحبزادی کوثر قدوائی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ رفیع احمد قدوائی کے خاندان میں شادی ہونے کی وجہ سے بیگم انیس قدوائی کے لیے مزید تعلیم کے دروازے کھل گئے۔ وہ اب سیاست میں بھی حصہ لینے لگیں اور اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ اردو ادب سے فطری دلچسپی تھی اس لیے مضامین بھی لکھنے لگیں۔ گاندھی جی کی ایماء پر بیگم انیس قدوائی دہلی چلی گئیں اور ملکی سیاست میں سرگرم حصہ لینے لگیں۔ کانگریس میں شامل ہو کر مجاہدِ آزادی کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ 16 رجولائی 1982 کو بیگم انیس قدوائی کا انتقال ہو گیا۔

سیاست کی مصروفیات کے باوجود بیگم انیس قدوائی اردو ادب کی خدمت سے غافل نہیں ہوئیں اور قلمی جہاد کے ذریعہ آزادی کے خونچکاں واقعات قلم بند کیے جو 'آزادی کی چھاؤں میں' کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپ گئے۔ یہ کتاب انیس قدوائی کی ایک تاریخی تصنیف ہے۔ جس کا بنیادی موضوع 1947ء کا خوفناک فرقہ وارانہ فساد ہے۔ ان کی دوسری کتاب 'اب جن کے دیکھنے کو......!' خاکوں کا مجموعہ ہے۔ تیسری کتاب 'نظرے خوش گذرے' ہے جو طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کی آخری اور چوتھی کتاب 'غبارِ کارواں' ہے جو ان کی نامکمل خودنوشت سوانح ہے۔

قدوائی خاندان

شفیع احمد قدوائی رفیع صاحب سے دو سال چھوٹے اور مجھ سے تقریباً نو دس سال بڑے تھے۔ شکل وصورت میں بھی بڑے بھائی سے کافی مختلف تھے اور طبعاً بھی ذرا تیکھے مزاج کے تھے۔ رفیع بھائی جتنے گول مٹول تھے، یہ اتنے ہی دبلے چھنگے اور لانبے۔ آخر عمر میں جسم بھاری پڑ گیا تھا۔ بہت ہی محتاط طبیعت کے انسان تھے۔ زمانہ طالب علمی میں رفیع بھائی کی حد سے بڑھتی ہوئی فضول خرچیوں اور فیاضیوں پر معترض بھی ہوتے تھے اور جب ان کی جیب خالی دیکھتے تو یہ بھی برداشت نہ ہوتا کہ ان کا ہاتھ پیسے کی کمی کی وجہ سے رکا رہے۔ اس لیے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم جو جیب خرچ سے بچ جاتی بھائی کو پیش کر دیتے تھے۔

1920 میں انہوں نے بی اے کرنے کے بعد خاندانی حالات سے مجبور ہو کر آگے پڑھنے کا خیال چھوڑ کر ملازمت کی خواہش کی اور ابا جان (امتیاز علی) کی کوشش سے ڈپٹی کلکٹری میں نامزد ہوئے۔ مگر انگریز کمشنر سے ملاقات کے وقت وہ آداب ومراسم جو ان دنوں حکام کے لیے رائج تھے، بجا نہ لا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمشنر نے ناخوش ہو کر ان کا نام خارج کر دیا اور ان کے والد سے شکایت کی۔ 1919ء میں جب رولٹ ایکٹ کے سلسلے میں ہنگامہ شروع ہوا اور کانگریس نے نیا موڑ لیا تو رفیع بھائی نے اپنے گاؤں اور ضلع میں کانگریس کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ کچھ یہ خبریں بھی کمشنر تک پہنچیں۔ ابا جان اس ناکامیابی سے بہت متاثر ہوئے مگر یہ دونوں بھائی خوش تھے کہ چلو جان چھوٹی۔

مگر حالات کا تقاضا تھا کہ ذریعہ آمدنی کچھ ہو۔ اس بیچ میں مجھ سے شادی بھی ہو گئی۔ آخر کار اسسٹنٹ کو آپریٹو رجسٹرار کی پوسٹ مل گئی اور تقریباً ایک سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ 1921 میں تحریک عدم تعاون (نان کو آپریشن) میں ملازمت سے استعفا دے کر شامل ہو گئے۔

ان کے والد (ابا جان) اپنے لائق ترین بیٹوں کی اس نالائقی پر تلملا اٹھے، لیکن وہ ایسے سخت گیر باپ تو نہ تھے کہ نوجوانوں کو اپنی مرضی اور اشاروں پر چلانا ضروری سمجھتے ہوں البتہ اپنی تکلیف خاندانی صورت حال، زمین

داری کی ابتر حالت سب کا تذکرہ کر کے انہیں روکنے کی کوشش ضرور کی۔ خود انہیں بیٹوں کی ان حرکتوں کی وجہ سے اپنی تحصیلداری بھی خطرے میں نظر آئی مگر جوان بیٹوں کو جبراً اپنی رائے ماننے پر مجبور نہیں کیا نہ انہیں گھر سے نکل جانے کو کہا۔ میں 1920 میں اپنی عمر اس قابل نہ ہونے کے باوجود کانگریس کی ممبر بن چکی تھی اور 1921 میں زنانہ کانگریس کمیٹیاں قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی بلکہ اس سلسلہ میں مسولی میں ایک بڑا جلسہ بھی کر ڈالا تھا۔ شفیع صاحب ملازمت چھوڑ کر آئے تو دل خوش ہو گیا اب وہ بھی باقاعدہ ممبر تھے اور دسمبر 1921 میں ستیہ گرہ تحریک میں حصہ لیتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔

دیہات سے ستیہ گرہی جتنے آتے تھے، ضلع کے صدر مقام بارہ بنکی میں گرفتاری کے لیے اپنے کو پیش کر دیتے تھے اس سے پہلے علی گڑھ سے بار بار آکر رفیع صاحب نے دیہات کا پیدل، بیل گاڑی اور یکہ پر مسلسل سفر کر کے یہ سب گاؤں آرگنائز کر دیئے تھے۔ ضلع کے ساتھی ست پر یکی جی وغیرہ ان کی آمد اور مشوروں کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب میرے خاندان کے تقریباً دس بارہ افراد بیک وقت گرفتار ہو گئے۔ گرفتار ہونے والوں میں میرے دور رشتہ کے چچا ارشد علی اور نسیم احمد کے علاوہ خالو جان نواب علی وکیل وراثت علی قدوائی کے والد ریاست علی، جو اپنے بزرگ رشتہ کے باوجود رفیع بھائی کے گہرے دوست بھی تھے۔ میرے ماموں جان، ایک رشتہ کے بھائی، غرض نوجوانوں کی اس گرفتاری کے بعد اب گھر میں صرف بڈھے دادا (ابا جان کے چچا) باقی تھے۔ ابا جان اپنی ملازمت پر شاید بجنور میں تھے۔ ظاہر ہے یہ خبر سن کر انہیں بہت شاک پہنچا۔ ان بیچاروں کو یہ پتہ بھی نہ تھا کہ گاؤں اور ضلع کے تمام نوجوان ایک دم سرکار برطانیہ کے باغی بن جائیں گے۔ اتفاق دیکھیے، اسی دن یا دوسرے دن میں ایک بچی کی ماں بن گئی۔ میری اس نازک حالت کی وجہ سے شفیع صاحب پریشان تھے۔ لیکن ملازمت چھوڑنے پر انہوں نے کچھ رقم اس موقع کے لیے مخصوص کر کے رکھوا دی تھی اس لیے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ یہ لڑکی مجھ سے صرف سولہ سال چھوٹی تھی۔ آزادی کی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی، اس لیے میں نے اس کا نام آزادی رکھا۔

لیکن میری ماں کو یہ بھونڈا سا نام پسند نہ آیا اور انہوں نے اس کا عقیقہ رفیعہ سلطان پر کروایا پڑھنے والوں کو تعجب ہوگا، اگر میں یہ بتاؤں کہ اس سے ایک سال پہلے پندرہ سال کی عمر میں بھی ایک کمزور منحنی بچے نے مجھ سے جنم

لیا تھا۔ جو صرف چند دن دنیا کی ہوا کھا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے مرنے پر میں بغیر کچھ سنے رو رہی تھی اور میری ماں مجھے تسکین و دلاسا دے رہی تھیں ایک لیڈی ڈاکٹر جسے شفیع صاحب نے لکھنو سے بھجوایا تھا، ایسے وقت پہنچی جب میں پرانی دائی کی تختۂ مشق بن چکی تھی۔ ظاہر ہے اس کے بعد میری والدہ مجھے علاج کے لیے لکھنو لے گئیں اور ایک ماہ بعد جب صحت یاب ہوئی تو پھر بالائے غم ہائے دگر میں گرفتار ہو گئی۔ یہ سب میری افتادِ طبیعت کے خلاف تھا۔ پہلے بچے کے لیے اس وقت نہ جانے کیوں آنسو نکلتے ہی چلے آرہے تھے۔ لیکن چند دن بعد اپنے دوستوں سے خوشی کا اظہار کرتی تھی کہ اچھا ہوا واپس چلا گیا بیکار مجھے ستاتا۔

مگر شفیع صاحب جوان تھے ان کے جذبات مجھ سے بالکل جدا ہوتے تھے۔ میری سیاسی دلچسپیاں خاندان والوں کی نظر میں معیوب تھیں۔ لیکن شفیع صاحب ہمیشہ خوش ہوتے تھے جب ودیشی کپڑے جلا دینے کو کانگریس کا حکم ہوا تو میں نے آگ کے شعلوں میں شادی کا جوڑا بھی ڈال دیا، رفیع بھائی نے کہا، 'شفیع کے کپڑے بھی لاؤ، اتفاق سے ان کا بھی شادی ہی کا ایک جوڑا تھا۔ اس وقت میری ماں رو دیں، ان کی نظر میں یہ بڑی منحوس بات تھی۔ اس وقت تک جیل سے متعلق بزرگوں کا نظریہ چوروں، ڈاکوؤں والی جیل کا تھا، اس لیے بڑا رونا دھونا گھروں میں ہوا، سوا میرے گھر کے۔

لفظ و معنی

محتاط	۔	احتیاط برتنا
فیاضی	۔	دل کھول کر خرچ کرنا
معترض	۔	اعتراض کرنے والا
پس انداز کرنا	۔	جمع کرنا
نامزد ہونا	۔	مقرر ہونا
مراسم	۔	دوستانہ تعلقات
رائج ہونا	۔	رواج پا جانا
تلملانا	۔	بہت زیادہ غصہ ہونا
سخت گیر ہونا	۔	سخت مزاج ہونا
تحصیلداری	۔	زمین داری
جبرا	۔	زبردستی

منحنی - ناٹا قد، دبلا پتلا، کمزور

معیوب - جس کو لوگ عیب سمجھتے ہوں

آپ نے پڑھا

- جنگ آزادی کے دوران قدوائی خاندان کے لوگوں کی سرگرمیوں کا مختصر سا حال آپ نے گزشتہ صفحات میں پڑھا۔ بیگم انیس قدوائی کی خودنوشت کا ایک حصہ ہے۔ اس میں خاص طور پر رفیع احمد قدوائی کا حال بیان ہوا ہے جو ایک اہم مجاہد آزادی تھے۔

آپ بتایئے

1. بیگم انیس قدوائی کا یہ مضمون کس صنف سے متعلق ہے؟
2. مضمون 'قدوائی خاندان' کے تخلیق کار کون ہیں؟
3. بیگم انیس قدوائی کی پہلی کتاب کب شائع ہوئی؟
4. بیگم انیس قدوائی کا انتقال کب ہوا؟

مختصر گفتگو

1. انیس قدوائی کی تعلیم سے متعلق مختصر جواب دیجیے۔
2. بیگم انیس قدوائی کی تصنیفات کے بارے میں لکھیے۔
3. خودنوشت کی تعریف کرتے ہوئے بتایئے کہ اس کا تعلق کس صنف ادب سے ہے؟

تفصیلی گفتگو

1. بیگم انیس قدوائی کے حالات زندگی کے بارے میں بیان کیجیے۔
2. تحریک آزادی پر روشنی ڈالیے۔
3. قدوائی خاندان کی سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. بیگم انیس قدوائی کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں اپنے استاد سے معلومات حاصل کیجیے۔
2. 'تحریک آزادی میں قدوائی خاندان کی خدمات' کے موضوع پر ایک مذاکرہ کیجیے۔

عصمت چغتائی

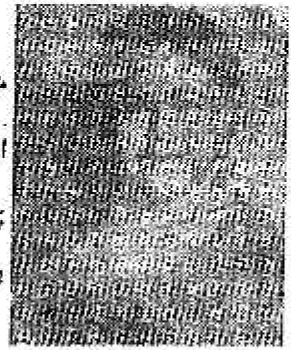

اردو کی خواتین نثرنگاروں میں عصمت چغتائی کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے متعدد افسانے اور ناول لکھے ہیں۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہے جس نے ادب اور زندگی کے براہ راست رابطے پر زور دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ادب خارجی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ادب ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا صرف ترجمان نہیں ہوتا بلکہ ہمارے مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔

عصمت چغتائی نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان میں جنسی نفسیات ایک ایسا موضوع ہے جس پر قلم اٹھاتے ہوئے بہت سے فنکار خود جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں مگر عصمت چغتائی نے اس موضوع کو بڑے معروضی انداز میں پیش کیا ہے اور کہیں بھی خود جذباتیت کی شکار نہیں ہوئی ہیں۔ عصمت نے معاشرے میں عہدے، منصب، دولت و ثروت اور خاندانی وجاہت کے بہانے عیش پرستی کرنے اور کمزور طبقے کا استحصال کرنے والے افراد کے پول کھول دیے ہیں۔ افسانوں کی طرح ان کی خودنوشت میں بھی بے باکی، بے خوفی، جرأت اور انفرادیت موجود ہے۔

عصمت 1910 میں بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام میرزا قسیم بیگ چغتائی تھا۔ والدہ کا نام نصرت خانم تھا۔ عصمت کے سات افسانوی مجموعوں کے علاوہ کئی ناول شائع ہو چکے ہیں۔ چھوئی موئی، بدن کی خوشبو، لحاف، ضدی، ٹیڑھی لکیر، سودائی اور ایک قطرۂ خون، ان کی مشہور تخلیقات ہیں۔ ان کا انتقال 1991 میں ہوا۔

میرا ادبی سفر

ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں۔ نگوڑے شیخ پتلی دال کھانے والے، مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال والوں پر پڑی ہوں۔ وہی اپنی پھوپی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہوگیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔ 'نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال کا، یہ سب نصیب کا پھیر ہے۔'

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہوگی۔

مگر مجھے بذات خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں، جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر پچر بچوں کے جم غفیر میں ایک پاپیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انہیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھیے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے۔ جن کی صحبت نے مجھے آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے، پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامذاق اور باتونی، آپس میں چونچیں چلتیں، نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر سان رکھ جاتی۔

ابا پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسید

ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجہ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور ان گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جاتیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے چھجوں پر قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔

'نوج بوا، نچھو کی لونڈیا ہے کہ موا بجار توبہ توبہ'

اور میری اماں جان نصرت خانم جنھیں لوگ پیار سے نچھو کہتے تھے۔ شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پٹوں۔ گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں ان گلیوں میں سارے، دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے جن سے اماں لرزا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے اپنے کنبہ میں آکر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ " ہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چالتی پرزہ ہیں۔ چھپ کر وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الہی توبہ۔ بڑھیوں کو چنیلیوں میں الو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی خاندان والوں سے وحشت ہوتی تھی۔ علی گڑھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی...... وہی پھوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت اور ان کھیتوں میں ککڑیاں، کھیرے چرانا، پیڑوں پر چڑھنا اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے اور نہ ان کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی، جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ عموماً سزا انہیں ملتی، الٹے ڈانٹ دیئے جاتے۔

علی گڑھ آکر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انہیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہوگئی مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے، ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چپتیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انہوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی۔ مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرتے املا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کو ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی اور اسی زمانہ سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں پڑھیں، خاک پلے نہیں پڑا۔ لہذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا تھا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آواز بازگشت بن گئی۔

'منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔' جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ بی نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں، اور عظیم بھائی نے میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے۔ بڑی ہشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں نپھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور ضدی تھی ان کی شہ پاکر اور بھی قابو سے باہر ہوگئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انہیں حرارت ہو جاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا۔ ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی بیٹی ان کی چھاتی سینکا کرتیں۔ اور وہ مجھے پڑھایا کرتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے

گئے اور چند صفحوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

'ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ تو اتنا کھانستے ہیں۔' میں نے جل کر کہا۔

'بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔' انہوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہوگئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے، چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلالیا۔ چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسمٰعیل، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ . . . کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئین تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

مثلاً میں بہت خوبصورت ہوں، بالکل حجاب اسمٰعیل کی ہیروئن کی طرح سنہری بال نیلی آنکھیں...... قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دراز ہوں، ہیرو آتا ہے...... میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا، شاید اس لیے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آ کر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار و قطار روتا، بے تابانہ مجھے چومتا اور میری حسین موت پر دھاڑیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انہیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ 'گندی' ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتہ کاری ہوگی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ سہ بارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہے۔ اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا روزنامچہ تھیں بلکہ وہ ان کہانیوں کا نچوڑ تھیں، جو مجھے بھا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہوگیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کاغذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے 'آہاہا...... بھتنی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ!'

شمیم نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔
میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی، سر میں بیسن ڈال چکی تھی اُفوہ بیان نہیں کر سکتی کہ کیا حالت ہوئی.....
یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔
ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارہ کاغذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے اُلٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بے چارا ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارہ پرلے درجہ کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لیے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔
اب اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آجاتی بس اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اول تو ایسی بیہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں اور اگر لکھوں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔
پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد چار سال میں نے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈرامہ، ٹوشن پلے اور شیکسپئر سے لے کر ایسبن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ 'فسادی' برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا۔ مواد میں نے اپنے اردگرد سے لیا۔ اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے سیکھا۔ بی ٹی کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی۔ اس لیے میں نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجہ سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔
اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا۔ جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر بھنا نہ جائے۔
پہلی دفعہ میں نے انہیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے جاڑے میں بیویاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈالے پنڈال کے اندر سوسوں کر رہی تھیں اور

رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاوز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سامنے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کے کٹے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کے بلاوز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر۔ مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم خاردار نہیں تھی۔ کیونکہ تقریر کے بعد انہیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بیباکی کا تہلکہ مچ گیا تھا اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر پہن لیا تھا۔ ۳۸ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگِ مرمر کے سارے بت منہدم کر دیئے۔

زندگی ننگی چم سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ انہیں کھا جاؤں، کیا کروں جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں۔ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا ہی کو اٹھا کر افسانوں کے طاقچہ میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی ہو سکتی تھیں مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا۔ ان کی بھرپور سیمابی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سولڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے مخمصہ میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پرانے بچھڑ گئے اور پھر۔

انجمن کے پرخچے اڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہوگیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جاسکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہوسکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیبا کی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہئے جو چھپر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں تجربہ سنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا۔ 'دھانی بانکیں' اور جڑیں سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور سے قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں۔ ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انہیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں ان پر فتح پائی جاسکتی ہے۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے۔ 'یہ نہ کرو، وہ نہ کرو' اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انہیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جاچکے تھے۔ میں ان سے ملنے جودھ پور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہوگئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضہ میں تھا۔

میں پہنچی تو ڈھنڈار اجڑے ہوئے کمرے میں اماں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انہوں نے محبت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانے میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے تھے، لڑائیاں ہوتی تھیں، ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا، اس اکیلے پن کو دیکھا۔ موٹے موٹے دس بچے پیدا کر کے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان ابل آیا۔ مامتا جاگ اٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا جو دنیا کو بساتی ہیں۔ مر مر کر جنم دیتی ہیں، انہیں پالتی پوستی ہیں، جو سب کچھ ان پر نچھاور کرتی ہیں نہ ان سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کرلے تو فرماں بردار ہے جو اپنے بال بچوں کے خرچہ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی اماں سے ملاقات ہوگئی اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مردہ خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے، ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے...... کائی چھٹ جاتی ہے...... جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لودینے لگتا ہے۔ انسان ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔

لفظ و معنی

جم غفیر	۔	بہت بڑی بھیڑ
پاپیادہ	۔	پیدل
مدقوق	۔	دق زدہ، ٹی بی کا مریض
محکوم	۔	مجبور، جس پر حکم چلایا جاتا ہے
خودسر	۔	اپنی رائے پر چلنے والا، گھمنڈی
شہ پاکر	۔	اشارہ پاکر
ہیبت زدہ	۔	خوفناک، گھبرایا ہوا
خاردار	۔	کانٹوں سے بھرا ہوا
واویلا	۔	ہنگامہ، شور
سیمابی شخصیت	۔	بے چین، بے قرار شخصیت
مخمصہ	۔	الجھن

پرخچے - ٹکڑے

مضراب - ستار پر ضرب لگانے کا ٹکڑا، تاروں کو چھیڑ کر آواز پیدا کرنے والا لکڑی کا ٹکڑا

آپ نے پڑھا

- عصمت چغتائی نے اپنی آپ بیتی میں اس ماحول کی خاص طور پر عکاسی کی ہے جس میں انہیں ایک منفرد فن کار کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع ملا۔ والدین اور بھائی بہنوں کا خصوصی ذکر ہے۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے زمانے میں سب سے زیادہ اثرات رشید جہاں سے حاصل کیے ہیں۔ رشید جہاں کے خیالات اور ان کی شخصیت عصمت چغتائی کے ذہن میں ہمیشہ ایک مثال بنی رہی۔ ان کے علاوہ وہ اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی سے بھی خاصی متاثر رہی ہیں۔
- عصمت چغتائی نے اپنی مختصر آپ بیتی میں اپنے خاندانی حالات بھی پیش کر دیے ہیں۔ اپنے عہد کی ادبی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے، اپنی تعلیم و تربیت، معاصرین سے تاثرات، اپنی پسند و ناپسند، اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی حالات — غرض ان تمام باتوں کا ذکر کر دیا ہے جو خود ان کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

آپ بتائیے

1. عصمت چغتائی کی والدہ کا نام کیا تھا؟ انہیں لوگ پیار سے کس نام سے پکارتے تھے؟
2. 'انگارے' کی مولف و مرتب کون تھیں؟
3. عظیم بیگ چغتائی سے عصمت چغتائی کا کیا تعلق تھا؟
4. مندرجہ ذیل محاورات واشارات کے معنی بتائیے۔

   قلانچیں بھرنا، گز بھر کی زبان، گھول کر پی لینا، شہ پانا، ہاتھ دھو بیٹھنا، ناک کے بل چلنا
5. 'منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔' یہ بات عصمت چغتائی نے کس کے ذکر میں کہی ہے۔

مختصر گفتگو

1. رشید جہاں سے عصمت چغتائی کی پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟
2. رشید جہاں نے ترقی پسند ادب کے ترجمان کے طور پر جو کتاب مرتب کی تھی اس کا نام کیا ہے؟
3. عصمت چغتائی آخری بار اپنی والدہ سے کہاں ملی تھیں؟

4. عصمت چغتائی کے والد پنشن لے کر کہاں رہنے لگے تھے؟

تخلیقی گفتگو

1. عصمت چغتائی رشید جہاں کی شخصیت سے کیوں متاثر تھیں؟
2. عصمت چغتائی کی شخصیت کے چند اہم پہلوؤں کی وضاحت کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. عصمت چغتائی کے بارے میں مزید کچھ باتیں جاننے کی کوشش کریں۔
2. عصمت چغتائی کے مشہور افسانوں کے بارے میں اپنے اساتذہ سے دریافت کیجیے۔

خاکا

خاکا انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے۔ شخصی خاکے کے لیے انگریزی میں Personal sketch کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو میں خاکے کے لیے جو اصطلاحیں رائج ہیں وہ 'مرقع اور قلمی' تصویر ہیں۔ یہ آج تک خاکا میں رائج ہے۔ خاکا ایسی نثری تحریر کو کہتے ہیں جس میں کسی شخصیت کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ متذکرہ شخصیت کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں متذکرہ شخصیت کے خیالات ،تصورات اور افکار ونظریات ، پلاٹ، کردار، عادات و اطوار سب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ خاکے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ شخصیت کی ظاہری و باطنی خصوصیات کے نمایاں اوصاف کو بیان کیا جائے جو اس کی انفرادیت اور شناخت کا ذریعہ ہیں۔

خاکا نگار کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ اس لیے خاکا نگار کا فرض اولیں ہوتا ہے کہ وہ کسی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں یعنی دونوں پہلوؤں کو بیان کرتا ہے۔ ورنہ شخصیت کی مکمل تصویر سامنے نہ آسکے گی جو خاکا نگاری کا اصل مقصد ہے۔

اردو میں خاکا نگاروں کی تعداد کافی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، محمد طفیل، شاہد احمد دہلوی، رشید احمد صدیقی، صبوحی، محمد حسن اور احمد یوسف وغیرہ قابلِ ذکر خاکا نگار ہیں۔

مولانا ولایت علیؒ

وہابی تحریک کی تاریخ کم سے کم 1831ء سے 1858ء تک بہت حد تک خاندانِ صادق پور، پٹنہ سیٹی کے ولایت علی و عنایت علی کی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس مشن کی ترقی و سربلندی کے لیے ان کے بے نفسانہ جوش اور تحریک کی خدمت میں ان کی طرح طرح کی قربانیوں کی سرولیم ہنٹر نے بھی کھلے دل سے تعریف کی ہے۔

یہ دونوں صادق پور پٹنہ سیٹی کے فتح علی کے فرزند تھے۔ بڑے بیٹے ولایت علی 1205ھ 91-1790ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا قد اوسط، رنگ سانولا اور تن و توش بھاری تھا۔ داڑھی رکھتے تھے۔ بھنویں جڑی ہوئی تھیں۔

تحصیل علم: چار برس کی عمر میں مکتب میں بٹھائے گئے۔ ذہانت و ذکاوت وافر سے سات برس کی عمر میں آپ کی استعداد اس حد تک پہنچی کہ مقررہ معلم سے آپ کی تشفی نہ ہونے لگی اور آخرش آپ کے والد بزرگوار مولوی فتح علی صاحب نے آپ کا سبق اپنے ذمہ لیا۔ پھر وہ لکھنو بھیج دیئے گئے۔ جہاں فرنگی محل کے عالم اشرف علی سے تعلیم حاصل کی۔ یہیں وہ سید احمدؒ سے ملے اور بیعت کی۔

شباب : اوائل عمری میں آپ بڑے بانکے تھے۔ آپ کا لباس و پوشاک لکھنو کے بانکوں سا تھا۔ اونچی چولی کا انگرکھا اور چوڑی دار پائجامے زری کے کام کا ٹخنے ڈھکے ہوئے پہنا کرتے اور صاحب زادوں کی طرح سونے کی انگوٹھیاں اور چھلے انگلیوں میں ڈالے رکھتے اور خوشبو اور عطریات سے بسے رہتے۔ آپ کے نانا مولوی رفیع الدین حسین صوبہ بہار کے آخری ناظم تھے اور جناب ولایت علی اپنے نانا کے بڑے لاڈلے تھے۔

ولایت علی کی پہلی شادی پندرہ سال کی عمر میں بی بی امیرن دختر مقصود علی ساکن قصبہ لبنا پکھٹولی، ضلع آرہ سے ہوئی۔ وہ لاولد وفات پا گئیں۔ ولایت علی نے دوسری شادی اپنے دکن کے قیام میں ایک مقامی امیر مرزا وحید بیگ کی بیٹی سے کی۔ اس شادی سے ان کی کئی اولادیں ہوئیں۔ پھر نکاح بیوگان کی سنت کو جاری کرنے کے لیے انھوں نے الٰہی بخش کی بیوہ دختر سے بھی شادی کی۔ یہ مقامی مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں میں نکاح بیوگان کی پہلی مثال تھی۔

1826ء کا سنہ آیا تو سید احمد صاحب نے آزاد قبائل کی طرف روانہ ہونے کا منصوبہ بنایا اور جب عازم ہجرت ہوئے تو مولانا ولایت علی بھی دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ ہم رکاب ہو گئے۔ سید صاحب نے راجستھان کے راستے سے جانے کا پروگرام بنایا کہ پنجاب سے ہو کر جانا آسان نہ تھا۔ اس موقع پر مولانا ولایت علی کو کابل کا سفیر بنا کر بھیجا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہاں سے بلا کر حیدر آباد میں تحریک کی تبلیغ و تنظیم کا کام سپرد کر کے متعین فرما دیا۔ چنانچہ ولایت علی بحسن و خوبی ان کاموں کو انجام دے رہے تھے کہ بمبئی میں بالاکوٹ کے دردانگیز سانحہ شہادت کی خبر ملی۔ ان خبروں نے ولایت علی کو مجبور کر دیا کہ وہ پٹنہ آ کر جماعت کی مزید تشکیل و ترتیب میں اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

پٹنہ پہنچ کر ولایت علی نے تحریک کی تنظیم نو اپنے ہاتھ میں لی۔ بہت سے لوگوں نے ولایت علی کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ انھوں نے مقامی مسجد ٹموہیاں کو جو پٹنہ میں وہابیوں کا ایک اہم مرکز تھی، محمد حسین کے ذمہ کیا اور اضلاع مظفر پور، دربھنگہ اور چھپرہ میں بھی تحریک کی ذمہ داری انھیں کو سونپی اور شہر کی ایک اور مسجد فخر الدولہ میں نماز جمعہ دوبارہ جاری کی۔

مولانا ولایت علی نہایت ہی سرگرمی کے ساتھ مرکز کے کاموں میں منہمک تھے کہ 1844ء کا سنہ آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سکھ حکومت کے خلاف انگریزوں کی سازشیں کامیاب ہو رہی تھیں اور گلاب سنگھ ڈوگرا والی جموں کی انگریز پرستی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ کچھ عجب طرح کی بے بسی اور افراتفری کا عالم تھا کہ سید ضامن شاہ رئیس بالاکوٹ نے جب اپنے علاقہ کے استحفاظ کی خاطر مدافعانہ کارروائیاں شروع کیں تو گلاب سنگھ ڈوگرا سے ٹکر ہو گئی۔ اس ٹکر میں جب ضامن شاہ نے اپنی پسپائی کا احساس کیا تو مولانا ولایت علی سے امداد کا طالب ہوا۔ مولانا نے پانچ سو مجاہدوں کا ایک جتھا مرتب کر کے اپنے بھائی مولانا عنایت علی کی قیادت میں بالاکوٹ روانہ کیا۔ مگر مولانا ولایت علی کو کچھ ایسی خبریں ملیں کہ دلی سکون نہ ہوا اور صادق پور مرکز کی ساری ذمہ داری اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین کے سپرد کر کے خود بالاکوٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولانا کی کمانداری میں جنگ کا یہ نقشہ ہوا کہ گلاب سنگ کی فوجوں کو شکست پر شکست ہونے لگی۔ یہ نقشہ دیکھ کر ضامن شاہ کے دل میں مجاہدوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کھٹکنے لگی اور اس نے غدرانہ روش اختیار کرنا شروع کر دی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ منصوبہ الحاق کے تحت انگریزی فوجیں پنجاب میں گھسنے لگی تھیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں جس انگریزی سامراجی حکومت نے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور رانی چندرا کو برداشت نہیں کیا وہ مولونا ولایت علی کو کیوں کر برداشت کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے ضامن شاہ کی اقتدار

پرستانہ ذہنیت سے فائدہ اٹھا کر اس کو آلۂ کار بنالیا اور پھر 1850 میں استھانہ کے لیے عازم ہجرت ہوئے اور دہلی پہنچے۔ یہاں انھوں نے جامع مسجد فتح پوری کے قریب ایک وسیع مکان میں قیام فرمایا۔ دوران قیام میں روزانہ وعظ کا سلسلہ قائم رہتا۔ اس مجلس وعظ میں بادشاہ بیگم زینت محل کے استاد مولانا امام علی اور دہلی کے مشہور اردو شاعر حکیم مومن خاں مومن بھی اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ مولانا کے وعظ و پند سے متاثر ہو کر یہ دونوں حضرات مولانا سے بیعت کے بعد حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ دہلی سے وہ اپنی منزلِ مقصود استھانہ پہنچ تو گئے مگر زیادہ دنوں تک زندگی نے وفا نہیں کی اور 5 رنومبر 1852 میں بعمر 64 برس رحلت فرما گئے۔ ستھانہ میں ہی مدفون ہوئے۔

('تذکرہ صادقہ' اور 'ہندوستان میں وہابی تحریک' سے ماخوذ)

لفظ و معنی

ملبوسات	۔	لباس و پوشاک
صاحب زادہ	۔	بیٹا
ترویج دین	۔	دین کی اشاعت
بارِ عظیم	۔	بڑا بوجھ
حلت	۔	حلال ہونا
حرمت	۔	حرام ہونا
شجاعت	۔	بہادری
ذکاوتِ وافر	۔	بے انتہا ذہانت
قائد	۔	رہنما، قیادت کرنے والا
رنگ محل	۔	لکھنو کی ایک قدیم درس گاہ کا نام
ہم رکاب	۔	سفر میں ساتھ رہنے والا
استحفاظ	۔	تحفظ کی چاہت
والیٔ جموں	۔	جموں کا حاکم

آپ نے پڑھا

- جنگ آزادی کے ایک مجاہد مولانا ولایت علی کا حال آپ نے گذشتہ صفحات میں مختصر طور سے پڑھا۔
- آپ نے پڑھا کہ ان کا تعلق علمائے صادق پور سے تھا۔ یہ ایسے علماء تھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں کھل کر حصہ لیا۔
- آپ نے کچھ ایسے ہندوستانی راجاؤں کا حال بھی پڑھا جنھوں نے اپنی سہولت اور ہوس کی خاطر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔

آپ بتایئے

1. مولانا ولایت صادق پوریؒ کب پیدا ہوئے؟
2. مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کے والد کا نام کیا تھا؟
3. مولانا ولایت علیؒ نے تحصیل علم کی شروعات کس عمر سے کی؟
4. مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کے نانا کا نام بتائیں۔
5. مولانا ولایت علی صادق پوریؒ نے کتنی عمر پائی اور کہاں وفات پائی؟
6. مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کا ہم عصر والی جموں وکشمیر کون تھا؟
7. گلاب سنگھ کون تھا؟ اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
8. مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کے فن حرب سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
9. مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کے مکان پر کافی تعداد میں طلبا ہوتے تھے۔ ان کے کھانے پینے کا نظم کہاں سے ہوتا تھا؟
10. مولانا ولایت علی صادق پوریؒ اور گلاب سنگھ کی جنگ کہاں ہوئی تھی؟
11. انگریزوں نے مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کی جمعیت کو توڑنے کی کوشش کی۔ کیوں؟
12. حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سے مولانا ولایت علی صادق پوریؒ نے کس مضمون میں استفادہ کیا؟
13. مولانا ولایت علی صادق پوریؒ نے کتنی شادیاں کیں اور پہلی شادی کے وقت آپ کی کیا عمر تھی؟
14. سید احمدؒ نے مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کو ہندوستان کے کس علاقہ کی خلافت عطا کی تھی؟
15. ضامن شاہ نے غدارانہ روش کیوں اختیار کی؟

16. دہلی میں قیام کے دوران مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کے وعظ کی مجلس میں شریک اور اہم شخصیتوں کے نام بتائیں؟

17. بالاکوٹ روانگی کے وقت مولانا ولایت علی صادق پوریؒ نے صادق پور مرکز کی ذمہ داری کس کے سپرد کی؟

مختصر گفتگو

1. مولانا ولایت علی کی ابتدائی زندگی کے احوال قلم بند کیجیے۔
2. مولانا ولایت علی صادق پوری کی غذا اور لباس کے بارے میں بتائیے۔
3. جنگ آزادی میں جن علماء نے حصہ لیا ان میں سے چند سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1. جنگ آزادی میں علمائے صادق پور کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. مولانا ولایت علی نے جنگ آزادی کی لڑائی میں کس طرح حصہ لیا؟ سمجھا کر لکھیے۔
3. جنگ آزادی میں مولانا ولایت علی کی معاونت کن لوگوں نے کی؟ اور کن لوگوں نے ان کی مخالفت کی؟

آئیے، کچھ کریں

1. اپنے استاد اور ساتھیوں کی مدد سے 'وہابی تحریک' کے بارے میں مزید باتیں جاننے کی کوشش کیجیے۔
2. تحریک آزادی میں علمائے صادق پور کی جو خدمات رہیں، ان کے بارے میں مزید کتابیں پڑھیے۔

ASSEL SOLUTIONS ASSOL PATNA

خطبہ

خطبہ لفظ خطاب سے مشتق ہے۔ خطبہ کی جمع خطبات ہے۔ اس لفظ کے مفہوم کے لیے اردو میں لکچر اور اڈریس جیسی اصطلاحیں بھی رائج ہیں۔ ادائیگی کے لحاظ سے خطبہ تقریر کی طرح ہوتا ہے لیکن تقریر سے خطبہ اس معنی میں الگ بھی ہے کہ خطبہ دینے والے عموماً بڑے دانش ور ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر خطبات کے موضوع بھی متعین ہوتے ہیں۔ تمام خطبے کا ایک بنیادی مقصد ہوتا ہے کہ ان کو زیادہ لوگ سنیں اور ان سے استفادہ کریں۔ خطبے کو تخلیقی ادب میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مختلف عوام کی مذہبی تاریخ کے مطالعہ سے خطبات کی ادبی و علمی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ مذاہب کے اندر پیغمبروں کی نصیحتیں، اولیائے کرام کے ملفوظات اور علمائے دین کے مواعظ خطبات کے زمرے میں آتے ہیں۔

ہندوستان میں جدید تعلیم کے فروغ کے دور میں خطبات کو باضابطہ ادبی شکل میں متعارف کرایا گیا۔ خصوصاً علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے زمانے میں اس عہد کے دانش وروں نے پورے ملک میں جو عوامی خطبات کا سلسلہ قائم کیا انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انگریز دانش وروں کے یہاں ایسے خطبات پہلے رواج پا چکے تھے اور انگریز دانش ور اپنے خطبات تحریری شکل میں بھی پیش کرنے لگے تھے۔

اسی زمانے میں سرسید احمد خان اور ان کے دیگر رفقائے کار اور سوامی وویکا نند کے تعلیمی خطبات اپنی افادیت ثابت کر چکے تھے۔ اردو میں پہلی بار سرسید کے علمی خطبات کو تحریری شکل دی گئی۔ سرسید کے رفقائے کار میں ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی کے علاوہ سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا علی میاں ندوی کے خطبات اردو نثر کے قیمتی ادبی سرمایے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطبات کی علمی و ادبی اہمیت مسلم ہے۔ ان خطبات کے نتیجے میں ہی ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی میں بے شمار اصلاحات پیش آئیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین کا خاندانی تعلق آفریدی پٹھانوں کے ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں یہ خاندان اتر پردیش کے ایک قصبہ قائم گنج میں آباد ہوگیا۔ ذاکر صاحب کے والد نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور ہجرت کر کے حیدر آباد چلے گئے جہاں ان کی وکالت چل پڑی۔ حیدر آباد میں ہی 8 رفروری 1897 کو وکیل صاحب کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ذاکر حسین رکھا گیا۔ بچپن میں ان کی تعلیم وتربیت اعلیٰ خاندان کے بچوں کی طرح انگریز ٹیوٹر کی سرپرستی میں ہوئی جب وہ نو سال کے ہوئے تو ان کے والد کا وصال ہوگیا۔ پھر ذاکر حسین اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن قائم گنج واپس آگئے اور ایٹہ ضلع کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔

1911ء میں ان کے آبائی ضلع فرخ آباد میں طاعون کی وبا پھیلی جس میں ذاکر حسین کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ذاکر صاحب نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ کالج کے ماحول سے ذاکر حسین بہت متاثر ہوئے اور یہیں ان کی شخصیت میں انقلابی تبدیلی آئی۔ اسی زمانے میں اکتوبر 1920ء میں مہاتما گاندھی اپنی عدم تعاون تحریک کی حمایت حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ تشریف لائے اور ایک جذباتی تقریر کی جس سے متاثر ہوکر ذاکر حسین عدم تعاون تحریک میں شامل ہوگئے اور علی گڑھ کالج کو خیر باد کہہ دیا۔ اسی زمانے میں ذاکر حسین نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جو بعد میں دہلی منتقل ہوکر یونی ورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر ذاکر صاحب جرمن تشریف لے گئے اور برلن یونی ورسٹی سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ وطن واپسی پر ذاکر حسین ماہر تعلیم کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ جہاں انھوں نے تعلیم کے میدان میں نئے نئے تجربات کیے۔

جب ملک آزاد ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بنایا۔ 1952 میں انھیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا گیا اور 1957ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین صوبہ بہار کے گورنر بنائے گئے۔ 1962ء میں وہ ملک کے نائب صدر جمہوریہ اور 1967ء میں صدر جمہوریہ ہند بنائے گئے۔ اسی عہدے پر فائز رہتے ہوئے 3 رمئی 1969ء کو ان کا انتقال ہوا اور دلی میں مدفون ہوئے۔

قومی تعلیم

تعلیم کے کام سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر ذہن کی تربیت تمدن کی ہر چیز سے نہیں ہوتی۔ جس طرح ہر جسم کو ایک غذا نہیں بھاتی، اس سے کہیں زیادہ ہر ذہن کو ہر ذہنی غذا بھی نہیں پچتی۔ بچہ جس سماج میں پیدا ہوتا ہے اس کے تمدن سے نسلی تعلق کی وجہ سے ہی اس کے ذہن میں کچھ مناسبتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس لیے خود اپنے سماج کے تمدن کی چیزوں سے اس کے ذہن کی بہتر تربیت ہو سکتی ہے۔ تربیت پا جانے، ترقی کر چکنے کے بعد ذہن سماج کی دوسری چیزوں کو بھی اپنا سکتا اور ان سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر شروع میں اپنی موروثی مناسبت کی وجہ سے ایک صورت میں بڑی آسانی اور دوسری میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں اس سے ہر وہ شخص جو تعلیم کے صحیح مقصد کو سمجھتا ہے اس بات پر مجبور ہے کہ بڑی حد تک، ذہن کی تربیت کے لیے خود اس سماج کی تمدنی چیزوں سے کام لے جس سے طالب علم کا تعلق ہے، ورنہ اس کی کوشش کے اکارت جانے کا ڈر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود تعلیم کی ماہیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم قومی تعلیم کا نظام قائم کریں۔

قومی تعلیم کے تعلق سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ماہرین تعلیم کو ملک کی مختلف مذہبی اور جغرافیائی جماعتوں کے علیحدہ علیحدہ یا بالکل ایک سے نظام کے متعلق غور کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ان کا فیصلہ یہی ہو جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تو ایک اور مشکل سوال کا حل انھیں سوچنا پڑے گا یعنی اس طرح اجزا کو تمدنی آزادی دے کر وہ متحدہ قوم اور اس کی ریاست کو کمزور تو نہیں کر دیں گے۔ اس لیے کہ اگر اجزاء کی اس آزادی کے ساتھ ہی کل کے ساتھ محبت کا نہایت مضبوط رشتہ قائم نہ ہوا تو بے شک یہ آزادی کل قوم کے لیے کمزوری اور بعض حالات میں ہلاکت کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمارے قومی نظام تعلیم کو اس مرکزی خیال کی ترویج کرنا ہوگی کہ جس طرح افراد کی ذہنی نشو ونما اور شخصیت کی تکمیل کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے سماج کے تمدن سے نشو نما دیں اور اس کی خدمت کو اپنی ترقی کا ذریعہ جانیں اس طرح ہمارے بڑے ہندوستانی سماج میں جو جو جماعتیں اور چھوٹے چھوٹے سماج ہیں ان میں بھی یہ عقیدہ نہایت پختہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی بہ حیثیت جماعت اس وقت پوری ترقی کر سکتی ہیں

جب کہ بڑے سماج کا اپنے کو خادم جانیں۔ اس کی بھلائی میں اپنی بھلائی اور اس کی برائی میں اپنی برائی دیکھیں۔ اس عقیدہ کا پیدا کرنا اگر سیاسی نظام کی خوبی پر منحصر ہے تو بہت حد تک نظام تعلیم پر بھی مبنی ہے۔

اور یہی کیا ایسے بے شمار سوال ہیں جن پر ہندوستان کے بہترین دماغوں کو غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً اگر ہمارا تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں ہو تو اس وقت بھی کیا مدرسے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قائم ہوا کریں گے اور ان کا مقصد بھی تندرست اچھے سچے آدمی پیدا کرنے کی جگہ چلتے پھرتے کتب خانہ پیدا کرنا ہوگا یا مختلف صلاحیت والوں کے لیے مختلف قسم کے مدرسے ہوں گے جس میں ابتدائی تعلیم کے بعد بچے بھیجے جا سکیں گے اور اپنے خاص ذہنی رجحان کے مطابق تعلیم پائیں گے؟ کیا اس وقت بھی مدرسوں کو بس اس سے سروکار ہوگا کہ علم سکھا دیا لیکن علم کے برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کا کوئی سامان نہ ہوگا؟ کیا اس وقت بھی ہمارا نصاب ایسا ہی چوں چوں کا مربہ ہوگا جیسا کہ اب ہے؟ کیا اس وقت بھی پیشہ اور عام تعلیم کو بالکل الگ الگ رکھا جائے گا، یا پیشہ کی تعلیم کا ایسا انتظام ہو سکے گا کہ وہی عام تعلیم کی مضبوط بنیاد ثابت ہو؟ غرض یہ اور ان جیسے ان گنت مسائل ہیں جن کا ذکر کر کے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اتنا بھی صرف اس لیے ذکر کیا کہ یہاں ایک بڑے قومی و ذی پیشہ کے کارکن جمع ہیں، انھیں اس طرف توجہ دلانے سے شاید اس بات کا موقع مل جائے کہ ہمارے تعلیمی کام کرنے والے ان مسئلوں پر غور کریں اور اپنی تحقیق کے نتائج کو قومی تعلیم کے کسی ادارے کی طرف سے شائع کر سکیں، تاکہ ہوتے ہوتے سب کے سوچ وچار سے قومی تعلیم کا ایک صحیح پروگرام تو تیار ہو جائے۔ اور اگر کل نظام کو ناموافق حالات کی وجہ سے رائج نہ کیا جا سکے تو کم سے کم ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو طے کرنے کے بعد نمونہ کے مدرسے قائم کیے جائیں اور کم سے کم تعلیم کی اس بنیادی منزل کو میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں ہی کے ذریعہ درست کرنے کی تدبیر کی جائے۔

قومی تعلیم کے اسی سوچ نے ہماری قوم میں بڑی بیداری پیدا کی ہے اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں نے اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب اس بیداری کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس زمانہ میں قومی تعلیم گاہوں کا قیام ہماری قومی زندگی کے لیے شاید سب سے زیادہ اہم واقعہ تسلیم کیا جائے گا۔

لفظ و معنی

قومی بیداری — عقل وشعور کے لحاظ سے قوم کا جاگنا

تسلیم کرنا	۔	مان لینا
تعلیم گاہ	۔	تعلیمی ادارہ
خادم	۔	خدمت کرنے والا
ضائع کرنا	۔	برباد کرنا
مختلف	۔	الگ الگ
تدبیر	۔	اُپائے
رائج کرنا	۔	رواج دینا
ناموافق	۔	موافق نہ ہونا، پریشان ہونا
کارکن	۔	کام کرنے والے
پیشہ	۔	کام کرنا
اثر انداز ہونا	۔	اپنا اثر ڈالنا
سروکار	۔	مقصد، تعلق
سوچ وچار	۔	غوروفکر
عقیدہ	۔	پختہ فکروخیال
مبنی	۔	بنیاد پر
منحصر کرنا	۔	بھروسہ کرنا
مسائل	۔	مسئلہ کی جمع، پریشانی
نتائج	۔	نتیجہ کی جمع
نظامِ تعلیم	۔	تعلیم دینے کا طریقہ
بے شمار	۔	ان گنت

آپ نے پڑھا

- ڈاکٹر ذاکر حسین نے قومی وِدیا پیٹھ کے جلسے میں جو خطبہ دیا وہ آپ نے گذشتہ صفحات میں پڑھا۔
- ڈاکٹر ذاکر حسین نے قومی تعلیم کے سلسلے میں مختلف سطحوں پر غوروفکر کا مشورہ دیا ہے تاکہ ایک یکساں پروگرام تیار ہوجائے۔ اس سلسلے میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسوں کے قیام کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے۔

آپ بتایئے

1. ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعلق کس گھرانے سے تھا؟
2. ذاکر حسین کے والد کس پیشے سے تعلق رکھتے تھے؟
3. ڈاکٹر ذاکر حسین کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
4. ذاکر حسین کس صوبہ کے گورنر رہے؟
5. ڈاکٹر ذاکر حسین انتقال کے وقت کس عہدے پر فائز تھے؟
6. ذاکر حسین کا انتقال کب ہوا؟

مختصر گفتگو

1. ڈاکٹر ذاکر حسین کا مختصر خاندانی پس منظر بیان کیجیے۔
2. قومی تعلیم کے موضوع پر پانچ جملے لکھیے۔
3. ماہر تعلیم کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعارف پیش کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1. قومی تعلیم کے موضوع پر ایک مضمون سپرد قلم کیجیے۔
2. ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی کارناموں کا جائزہ لیجیے۔
3. ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی کارناموں کا ایک خاکہ تیار کیجیے۔
2. کلاس کے طلبہ کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت پر ایک مذاکرہ کیجیے۔

نظم

نظم کے لغوی معنی، انتظام و ترتیب یا آرائش، کے ہیں، عام مفہوم میں یہ لفظ نثر کے مدِ مقابل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے اس میں وہ تمام اصناف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں جو ہیئت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں، اصطلاحی معنوں میں غزل کے علاوہ تمام شاعری کو 'نظم' کہتے ہیں۔

عام طور پر نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ خیال کا تدریجی ارتقا بھی نظم کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ ارتقا طویل نظموں میں زیادہ واضح ہوتا ہے جب کہ مختصر نظموں میں ارتقا واضح نہیں ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔

نظم کے لیے نہ تو ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوعات کی۔ چناں چہ اردو میں غزل اور مثنوی کی ہیئت میں نظمیں اور آزاد و معرا نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس طرح کوئی بھی موضوع نظم کا موضوع ہو سکتا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے نظم کی چار قسمیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ پابند نظم : پابند نظم ہم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترکیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی جاتی ہے۔ نئے انداز کی ایسی نظمیں بھی، جن کے بندوں کی ساخت مروجہ ہیئتوں سے مختلف ہو یا جن کے مصرعوں میں قافیوں کی ترتیب مروجہ اصولوں کے مطابق نہ ہو، لیکن ان کے تمام مصرعے برابر کے ہوں اور ان میں قافیے کا کوئی نہ کوئی التزام پایا جائے، پابند نظم کہلاتی ہے۔

نظم معرا: نظم معرا ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جس کے تمام مصرعے برابر کے ہوں مگر ان میں قافیے کی پابندی نہ ہو۔ نظم معرا کو نظم عاری بھی کہا جاتا ہے۔

آزاد نظم: آزاد نظم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں قافیے اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی اور اس کے ارکان بحر کم یا زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں۔

نثری نظم : نثری نظم چھوٹی بڑی نثری سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں نہ تو ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی بحر اور وزن کی۔

خواجہ الطاف حسین حالی

پورا نام خواجہ الطاف حسین تھا اور تخلص حالؔی کرتے تھے۔ ان کی پیدائش 1837ء میں ضلع کرنال کی مشہور جگہ پانی پت میں ہوئی۔ خواجہ ایزد بخش ان کے والد کا نام تھا۔ نو برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ان کی پرورش کی۔ پانی پت کے مشہور حافظ ممتاز حسین کی نگرانی میں قرآن شریف حفظ کیا۔ حالؔی کی باضابطہ تعلیم نہیں ہوئی لیکن انھوں نے کچھ فارسی سید جعفر علی سے اور عربی صرف و نحو میں تعلیم حاجی ابراہیم حسین سے حاصل کی۔ ان کی شادی سترہ برس کی عمر (1854ء) میں اپنے ماموں میر باقر کی صاحب زادی اسلام النسا سے ہوئی۔ حالؔی کے معاشی حالات خراب تھے۔ انھوں نے دہلی آکر بے سروسامانی کے عالم میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔ یہاں ان کی ملاقات غالب سے ہوئی۔ انھوں نے اپنی کچھ غزلیں غالب کو دکھائیں۔ غالب نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت ان کا تخلص خستہ تھا۔

حالؔی 1856ء میں معاش کی تلاش میں نکلے اور انھیں حصار میں معمولی تنخواہ پر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں جگہ ملی۔ کچھ دنوں کے بعد حالؔی پھر دلی آئے یہاں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ان سے متاثر ہو کر اپنے بچوں کی اتالیقی ان کے سپرد کی۔ شیفتہؔ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہوئے۔ حالؔی کی نظموں سے اردو میں نظم جدید کی راہ ہموار ہوئی۔ انھوں نے دلی کے اینگلو عربک اسکول میں تدریسی فرائض بھی انجام دیئے۔ حالؔی نے پانی پت میں ایک لائبریری بھی قائم کی۔

مولانا حالؔی اپنے دور کے ممتاز تنقید نگار اور شاعر کی حیثیت سے شہرت یافتہ ہیں۔ انھوں نے اردو میں تنقید نگاری کو باضابطہ ایک صنف ادب کی طرح متعارف کرایا۔ ان کی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ تصنیف دراصل وہ مقدمہ ہے جو انھوں نے اپنے اہم شعری کارنامے 'مسدس حالؔی' کے پیش لفظ کے طور پر لکھا تھا۔ مسدس حالؔی 'مدوجزر اسلام' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ مسدس سرسید کی اصلاحی تحریک کے نتیجہ میں تخلیق کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود سرسید نے اس کی خوب تعریف کی ہے۔

حالؔی نے نثر و شاعری کے دوسرے شعبوں میں بھی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ غزل گوئی اور نظم نگاری کے ارتقاء میں بھی ان کی اہم خدمات رہی ہیں۔ انھوں نے سرسید کی سوانح بہ عنوان 'حیات جاوید' اور غالب کی سوانح بہ عنوان 'یادگارِ غالب' لکھ کر سوانح نگاری کی بھی ایک مضبوط روایت قائم کر دی ہے۔ 31 دسمبر 1914 کو حالؔی کا انتقال ہوا اور پانی پت میں دفن ہوئے۔

مسدّسِ حالی

کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر　　تو ہوتے ہیں مسخ ان سے پہلے تونگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر　　نہ عقل ان کی ہادی نہ دین ان کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا　　نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا　　تعیش میں جینا نمائش پہ مرنا
سدا خواب غفلت میں بے ہوش رہنا
دم نزع تک خود فراموش رہنا

پریشان اگر قحط سے اک جہاں ہے　　تو بے فکر ہیں کیونکہ گھر میں سماں ہے
اگر باغ امت میں فصل خزاں ہے　　تو خوش ہیں کہ اپنا چمن گلفشاں ہے
بنی نوع انساں کا حق ان پہ کیا ہے
وہ اک نوع نوع بشر سے جدا ہے

کہاں بندگان ذلیل اور کہاں وہ　　بسر کرتے ہیں بے غم قوت ناں وہ
پہنتے نہیں جز سمور و کتاں وہ　　مکاں رکھتے ہیں رشک خلد و جناں وہ
نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر
نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا　　کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا　　خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

عمل جن کا تھا اس کلام متیں پر — وہ سرسبز ہیں آج روئے زمیں پر
تفوق ہے ان کو کہین مہیں پر — مدار آدمیت کا ہے اب انھیں پر

شریعت کے جو ہم نے پیماں توڑے
وہ لے جا کے سب اہلِ مغرب نے جوڑے

عروج ان کا جو تم عیاں دیکھتے ہو — جہاں میں انہیں کامراں دیکھتے ہو
مطیع ان کا سارا جہاں دیکھتے ہو — انھیں برتر از آسماں دیکھتے ہو

یہ ثمرے ہیں ان کی جوانمردیوں کے
نتیجے ہیں، آپس کی ہمدردیوں کے

لفظ و معنی

مسخ	۔	بگڑنا، خراب ہونا
تونگر	۔	مالدار
ہادی	۔	راستہ بتانے والا
عقبیٰ	۔	آخرت
مفلوک	۔	پریشاں حال، غریب
تعیش	۔	عیش پسندی
نزع	۔	موت کا وقت
بنی نوعِ انساں	۔	انسانوں کی جماعت
سمور	۔	لومڑی کی کھال کا لباس، قیمتی لباس
کتاں	۔	ایک قیمتی کپڑا
خلد	۔	جنت

جناں	۔	جنت
خلائق	۔	خلق کی جمع، مخلوقات
ولا	۔	دوستی، محبت
کلامِ متین	۔	طاقت ور کلام (قرآن کریم)
تفوق	۔	برتری
کہین و مہین	۔	جمع ہے کہ و مہ (کہتر و مہتر) بہ معنی چھوٹے بڑے لوگ
مدار	۔	انحصار
کامران	۔	کامیاب، فتح مند، فاتح
مطیع	۔	فرماں بردار

آپ نے پڑھا

- زیر نصاب نظم خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی مسدس حالیؔ سے ماخوذ ہے۔
- یہ الگ سے کوئی نظم نہیں ہے بلکہ فکری تسلسل کا لحاظ کرتے ہوئے مسدس حالیؔ کے چند بندوں کو ترتیب دے کر نظم کی شکل دے دی گئی ہے۔
- مسدس حالیؔ مسلمانوں کے عروج و زوال کی منظوم داستان ہے جو سرسید کی فرمائش پر حالیؔ نے تصنیف کی۔
- زیر نصاب نظم کے اشعار میں شاعر نے ملت کے نوجوانوں کی غفلت اور بے حسی کا رونا رویا ہے۔ ساتھ ہی نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کا حل بھی نکالا ہے اور مسلم نوجوانوں کو مخاطب کر کے بہت ہی سبق آموز نصیحتیں کی ہیں۔ نظم میں شاعر کا واعظانہ پہلو نمایاں ہے۔

آپ بتایئے

1. سرسید کی فرمائش پر حالیؔ نے کون سی کتاب لکھی؟
2. مسدس حالیؔ کا دوسرا مشہور نام کیا ہے؟
3. مسدس حالیؔ کس کی تجویز پر تخلیق کیا گیا؟
4. حالیؔ کا پورا نام کیا ہے؟

5. حالیؔ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

مختصر گفتگو

1. حالیؔ کی کون سی تصنیف لوگوں کو زبانی یاد تھی؟
2. حالیؔ کی دو مشہور سوانحی کتابوں کا نام بتایئے۔
3. حالیؔ نے لائبریری کہاں قائم کی؟

تفصیلی گفتگو

1. حالیؔ نے مسدس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ پیش کیا ہے۔ تفصیل سے اس پر روشنی ڈالیے۔
2. حالیؔ کی حیات و خدمات پر اپنے خیالات قلم بند کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. متذکرہ بالا بندوں میں سے پانچویں اور چھٹے بندوں کا مفہوم بیان کیجیے۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

ساحر لدھیانوی

اصل نام عبدالحئی نیز چودھری عبدالحئی تھا۔ ساحر تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام چودھری فضل محمد تھا۔ یہ لودھوال کے جاگیردار تھے۔ ساحر کی والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔ یہ فضل محمد کی گیارہویں بیوی تھیں۔ ان سے پہلے کسی بھی بیگم سے اولاد نرینہ نہ تھی۔ سردار بیگم کی بطن سے ساحر، بزرگوں کی دعا درگاہ صابر کلیری اور خانقاہوں میں منت وسماجت کے نتیجے میں 8 مارچ 1921ء کو پیدا ہوئے۔

ساحر کی ابتدائی تعلیم مولانا فیاض ہریانوی کی تربیت میں ہوئی اور ان سے فارسی سیکھی۔ پنجابی تو مادری زبان تھی۔ اردو اور انگریزی پر دسترس حاصل تھی۔ 1937ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا۔ ان کے مضامین میں فلسفہ اور فارسی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

ساحر کی نظمیں 1940ء سے ہفتہ وار 'افغان' (بمبئی)، ہفتہ وار، کیرتی لہر، (میرٹھ) میں شائع ہونے لگیں۔ اب ساحر اپنی والدہ کے ساتھ لاہور آگئے تھے اور دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ اسی کالج سے انہوں نے عوامی زندگی کا مشاہدہ کیا اور یہ شعور مسلسل چلا پاتا رہا۔ دیال سنگھ کالج سے نکل کر ساحر نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ لیکن 1943ء میں یہ سلسلہ بھی موقوف ہوگیا۔

ساحر نے رسالہ 'ادب لطیف' کی ادارت کی 1945ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس میں ساحر نے شرکت کی اور ایک مقالہ جدید انقلابی شاعری پر پڑھا۔ جس کی بہت زیادہ پذیرائی ہوئی۔ ساحر رسالہ 'سویرا' اور 'شاہراہ' سے بھی وابستہ ہوئے اور پھر ان کا تعلق فلموں سے ہوگیا جس کے بعد وہ ممتاز گیت کار ثابت ہوئے۔ ساحر کا آخری پڑاؤ فلم انڈسٹری ہی تھا۔ ساحر کے کلام کا مجموعہ 'تلخیاں' (1940ء)، 'پرچھائیاں' (1951ء)، 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' (1971ء) اور 'گاتا جائے بنجارہ' وغیرہ ہیں۔

ساحر ترقی پسند شاعر ہیں ان کی شاعری میں زندگی کی تلخ سچائیاں ہیں۔ دوسروں کی طرح وہ مزدوروں کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری متوسط طبقے کے عام تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرف ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی: 'ان کے طرز میں نہ تو جدید اشاریت اور موہوم کیفیات کی عکاسی ہے اور نہ ہی کھردرا پن۔ اس میں ایک وضاحت، بے ساختگی اور شیرینی ہے جو براہِ راست عام نوجوانوں کو متاثر کرتی ہے'۔ 25/ اکتوبر 1980ء کو ساحر کا انتقال ہوگیا۔

پرچھائیاں

جوان رات کے سینے میں دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسم نازنیں کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت، کبھی یقیں کی طرح
وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے ہیں
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح

انھیں کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں
نہ جانے کتنی کشاکش سے کتنی کاوش سے
یہ سوتے جاگتے لمحے چرا کے لائے ہیں

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انھیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگِ بے اماں ہی ملی
انھیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں
بہت دنوں سے ہے یہ خبط حکمرانوں کو
کہ دور دور کے ملکوں میں قحط بو جائیں

بہت دنوں سے جوانی کے خواب ویراں ہیں
بہت دنوں سے محبت پناہ ڈھونڈتی ہے
بہت دنوں سے ستم دیدہ شاہراہوں میں
نگارِ زیست کی عصمت پناہ ڈھونڈتی ہے

چلو کہ آج سبھی پائمال روحوں سے
کہیں کہ اپنے ہر اک زخم کو زباں کر لیں
ہمارا راز، ہمارا نہیں سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانے کو رازداں کر لیں

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اُس پیرہن سے نفرت ہے

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا
تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی

ہر ایک موجِ ہوا رخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی

اٹھو کہ آج ہر اک جنگجو سے یہ کہہ دیں
کہ ہم کو کام کی خاطر گلوں کی حاجت ہے
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے

کہو کہ اب کوئی تاجر ادھر کا رخ نہ کرے
اب اس جگہ کوئی کنواری نہ بیچی جائے گی
یہ کھیت جاگ پڑے اٹھ کھڑی ہوئیں فصلیں
اب اس جگہ کوئی کیاری نہ بیچی جائے گی

یہ سرزمین ہے گوتم کی اور نانک کی
اس ارضِ پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے کبھی
ہمارا خون امانت ہے نسلِ نو کے لیے
ہمارے خون پہ لشکر نہ مل سکیں گے کبھی

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے، مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے، مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

الفاظ و معنی

دہقاں	۔	کاشت کار، کسان
افلاس	۔	غریبی، تنگ دستی
خلوت	۔	تنہائی، گوشہ نشینی، خواب گاہ
جلوت	۔	باہر، سب کے سامنے
عریاں	۔	ننگا، برہنہ
محاذ	۔	لڑائی کی جگہ، مقابل، سامنے
الم	۔	رنج، غم، دکھ
فراست	۔	دانائی، تیز فہمی
گام	۔	راستہ، منزل
مرگ	۔	موت، اجل
پیرہن	۔	پوشاک
افق	۔	آسمان کا کنارہ
تصورات	۔	خیالات، دھیان
ساکت	۔	ٹھہرا ہوا، جامد
کاوش	۔	کوشش
مسرت	۔	خوشی

خشک	-	سوکھا
عجز وکرم	-	انکساری ومہربانی
جزیرہ	-	ٹاپو، خشکی کا وہ حصہ جس کے چاروں طرف پانی ہو
صدائیں	-	آوازیں
طنابیں	-	خیمے کی رسی
خراشیں	-	چھلن، رگڑ
قبائیں	-	لباس، ایک قسم کا لمبا کوٹ جو آگے سے کھلا ہوتا ہے

آپ نے پڑھا

- شاعر نے اس نظم میں اپنی یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز یعنی اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ ایک فرد متعدد خانوں میں منقسم رہتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی محبت، سماجی ذمہ داری، بڑھتے ہوئے مسایل، بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور تہذیب وتمدن میں فطری طور پر وہ آنے والے تغیرات کے درمیان کبھی ایک تماشائی بن جاتی ہے اور کبھی ان تمام عوامل کے لیے آلۂ کار بننا پڑتا ہے۔
- شاعر نے ابتدائے شعور سے لے کر عمر کی بڑھتی ہوئی منزلوں کی، نجی اور خارجی مسائل وحالات کی شاعرانہ عکاسی کی ہے۔

آپ بتائیے

1. شاعر نے اپنی نظم کا عنوان 'پرچھائیاں' کیوں رکھا ہے؟
2. نظم 'پرچھائیاں' میں کن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے؟
3. 'تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں'

   مندرجہ بالا مصرع کی وضاحت کیجیے۔
4. جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل   مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح

   درج بالا شعر کی تشریح کیجیے۔

مختصر گفتگو

1. ساحر کا اصل نام کیا ہے؟

2. ساحؔر کا سنہ پیدائش کیا ہے؟

3. شاعر کے ذہن میں کس کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں؟

4. ساحؔر کے دو شعری مجموعے کا نام لکھیے۔

5. ساحؔر پہلے پہل کس رسالے کے اڈیٹر ہوئے؟

6. ساحؔر کا انتقال کب ہوا؟

تفصیلی گفتگو

1. نظم 'پرچھائیاں' کا مرکزی خیال لکھیے۔

2. نظم کی تعریف کیجیے اور اس کی قسمیں بتائیے۔

3. نظم کے آخری بند میں شاعر نے کیا کہا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

4. مندرجہ بالا الفاظ کے جملے بنائیے۔

تصورات، پرچھائیاں، فضا، اداسی، تمنا، تجارت، خط

5. واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنائیے۔

قوم، افواج، اقسام، تجار، فرد، فقیر، آراء، مساکین

آئیے، کچھ کریں

1. ساحؔر لدھیانوی کی شاعری سے متعلق دس جملے لکھیے۔

2. نصاب میں شامل نظم کے دو بند یاد کیجیے۔

زبیر رضوی

پورا نام سید زبیر احمد رضوی اور والد کا نام سید محمد رضوی ہے۔ زبیر رضوی 1936ء میں امروہہ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ زبیر رضوی کی ابتدائی تعلیم امروہہ اور حیدر آباد میں ہوئی۔ لیکن اردو میں ایم۔ اے دلی یونی ورسٹی سے کیا۔ ان کی پہلی تحریر 1969ء میں 'ماہ نو' کراچی میں شائع ہوئی۔

ان کی تخلیقات میں 'لہر لہر ندیا گہری'، 'خشت دیوار'، 'دامن'، 'پرانی بات ہے'، 'انگلیاں فگار اپنی'، 'دھوپ کا سائبان' اور 'مسافت شب' ہے۔ ان کی کلیات 'پورے قد کا آئینہ' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ زبیر رضوی کی دوسری کتابیں 'غالب اور فنونِ لطیفہ' اور 'اردو فنون وادب' ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔ اسی ملازمت سے اپریل 1993ء میں ڈائرکٹر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

زبیر رضوی کی نظمیں زندگی اور سماج کی بوقلمونی کو بیش از بیش پیش کرتی ہیں۔ ان کی نظمیں عام طور پر مختصر ہوتی ہیں لیکن ان میں جامعیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

یہ ہے میرا ہندوستان

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

ہنستا، گاتا، جیون اس کا، دھوم مچاتے موسم
گنگا، جمنا کی لہروں میں سات سُروں کے سرگم
تاج، ایلورہ جیسے سندر تصویروں کے البم

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

دن البیلے، راتیں اس کی مستی کی سوداگر
دھرتی جیسے پھوٹ بہی ہو دودھ کی کچی گاگر
اونچے اونچے پربت اس کے نیلے نیلے ساگر

یہ ہے میرا ہندستان
میرے، سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

بادل جھومے، برکھا برسے، پون جھکولے کھائے
دھرتی کے پھیلے آنگن میں یوں کھیتی لہرائے
جیسے بچہ ماں کی گود میں رہ رہ کے مسکائے

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

رادھا، سیتا، چندر گائے، گائے اندوبالؔ
نینوں میں کاجل کے ڈورے سرخ گلابی گال
زلفوں کی وہ چھایا جیسے شملہ، نینی تال

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

ڈھولک باجی، مہندی لاگی، رنگ رنگیلا ساون
سکھیاں مل مل ہولی کھیلیں، سانوریا کے آنگن
گھونگھٹ میں گوری شرمائے پیا ملن کے کارن

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

راجہ، رانی، گڈا، گڈی اور پریوں کی کہانی
بچوں کے جھرمٹ میں سنائے بیٹھ کے بوڑھی نانی
لوری گائے، ماتھا چومے، ممتا کی دیوانی

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

البیلا پنجاب ہے اس کا رومانوں کی بستی
صبحِ بنارس، شامِ اودھ اور شالامار کی مستی
بمبئی جیسے شہر ہیں اس میں دلی جیسی بستی

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

غالبؔ اور ٹیگورؔ یہیں کے میراؔ کالیداسؔ
یہیں ہوا تھا سچائی کا گوتمؔ کو احساس
یہیں لیا تھا ساتھ رام کے سیتا نے بن باس

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

مندر، مسجد ہیں تو کہیں ہیں گرجا اور شوالے
ملاّ، پنڈت، گیتا اور قرآن کے ہیں متوالے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی دیش کے سب رکھوالے

یہ ہے میرا ہندستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

لفظ و معنی

بستی - گاؤں
سپنا - خواب
گاگر - گھڑا

ساگر - سمندر

پیار - محبت

سوداگر - تاجر، تجارت کرنے والے

دیش - ملک، وطن

سُر - دُھن

پون - ہوا

آپ نے پڑھا

- اس گیت میں شاعر نے اپنے وطن ہندوستان سے اپنی اٹوٹ گہری محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ہر بند میں ہندوستان کے حسین مناظر کو پیش کیا ہے۔ شاعر نے اپنے اردگرد کی تمام چیزوں کا گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہاں گنگا جمنا کی لہریں گاتی رہتی ہیں۔ تاج محل اور ایلورا جیسے حسین مناظر ہیں یہاں کی زمین پاک صاف ہے۔ اونچے پہاڑوں سے یہاں حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں کی زرخیز زمین میں کھیتی لہلہاتی رہتی ہے۔ یہاں کے ہر خطے کا الگ الگ حسن دل کو کھینچتا ہے۔ یہاں کے پرب تہوار میں سب مل جل کر خوشیاں مناتے ہیں۔ یہاں کے گاؤں میں سکون اور شانتی ہے۔ شہروں میں ہماہمی کے باوجود رومان اور مستی ہے۔ یہاں بڑے بڑے فنکاروں اور صوفیوں نے جنم لیا ہے۔ تمام مذہب وملت کے لوگ مل جل کر اپنے مذہب کے امور انجام دیتے ہیں۔ غرض ہندوستان کی سرزمین امن، شانتی، سکون اور فطری حسن کا گہوارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں شاعر اپنے ملک سے محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ بڑا فطری معلوم ہوتا ہے۔

آپ بتایئے

1. زبیر رضوی کی جائے پیدائش کہاں ہے؟

(الف) میرٹھ　　(ب) امروہہ　　(ج) حیدرآباد　　(د) دلی

2. زبیر رضوی کا سنہ پیدائش کیا ہے؟

(الف) 1936ء　　(ب) 1937ء　　(ج) 1938ء　　(د) 1940ء

3. 'لہر لہر ندیا گہری' کس شاعر کا شعری مجموعہ ہے؟

(الف) بیکل اتساہی　　(ب) اجمل سلطان پوری　　(ج) زبیر رضوی　　(د) وسیم بریلوی

4. جمنا ندی کہاں ہے؟

(الف) بہار　　(ب) جھارکھنڈ　　(ج) اڑیسہ　　(د) دلی

5. شاعر نے سپنوں کا جہان کسے کہا ہے؟

(الف) اپنی اولاد کو　　(ب) اپنے والدین کو　　(ج) اپنے وطن ہندستان کو　　(د) ان میں سے کسی کو نہیں

مختصر گفتگو

1. زبیر رضوی کس ملازمت سے وابستہ رہے؟
2. زبیر رضوی کا پورا نام بتائیے۔
3. زبیر رضوی کے تین شعری مجموعوں کا نام بتائیے۔
4. زبیر رضوی کی پہلی تحریر کس رسالے میں شائع ہوئی؟

تفصیلی گفتگو

1. زبیر رضوی کے بارے میں دس سطریں لکھیے۔
2. زبیر رضوی نے اپنی نظم 'یہ ہے میرا ہندستان' میں کن کن شہروں کا نام لیا ہے؟ کسی ایک شہر کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
3. شاعر کے خیال میں اس کا وطن کیسا اور کہاں ہے؟
4. واحد سے جمع بنائیے۔

شعر، تصویر، مندر، مسجد، قوم

5. جملوں میں استعمال کیجیے اور جنس بتائیے۔

تصویر، مندر، مسجد، قرآن، کھیتی

آئیے، کچھ کریں

1. زبیر رضوی کی شاعری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. زبیر رضوی کے کچھ اور گیتوں کو اپنی کاپی پر لکھیے۔
3. زبیر رضوی کا یہ گیت زبانی یاد کر کے سنائیے۔

ظریفانہ نظم

ظرافت، مزاح اور طنز ادب کی کوئی صنف نہیں ہے بلکہ ہر صنف میں اس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مزاح اور ظرافت ہنسنے ہنسانے کا نام ہے۔ باتوں کو اس انداز سے پیش کرنا کہ پڑھنے پر بے ساختہ ہنسی آجائے مزاح کی خصوصیت ہے اور طنز میں کسی کی برائی پر نشانہ باندھا جاتا ہے۔ نشانہ سیدھے سادے باندھا جائے تو طنز ہے اور اگر مزاح کے ساتھ ہنستے ہنساتے الٹے پلٹے انداز میں پیش کیا جائے تو ظرافت ہے۔

اردو کے مزاحیہ شاعروں میں اکبر الہ آبادی بہت مشہور ہیں۔ شوکت تھانوی، دلاور فگار، رضا نقوی واہی اور احمد جمال پاشا مزاحیہ شاعروں میں قابلِ ذکر ہیں۔

دلاور فگار

دلاور فگار کا اصل نام دلاور حسین تھا۔ لیکن دلاور فگار کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ یہ 1928ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1942ء میں ہائی اسکول کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ان کے والد ماسٹر شاکر حسین مقامی اسکول میں استاد تھے۔ دلاور فگار کے لیے یہ اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔

بہرطور کسی صورت سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ اور بی اے کیا۔ اور ایک ادارے میں استاد مقرر ہوئے۔ یہ تعلیم سے غافل نہ رہے۔ معاشیات میں ایم۔ اے کیا۔ پھر اردو میں ایم اے کیا اور فرسٹ کلاس آئے۔

دلاور فگار کا شعری مجموعہ 'حادثے' 1954ء میں شائع ہوا۔ 1963ء میں مزاحیہ وطنزیہ قطعات اور نظموں کا مجموعہ 'ستم ظریفیاں' منظر عام پر آیا۔ ان کے شعری مجموعوں میں 'شامتِ اعمال' 'مطلع عرض ہے' اور 'آداب عرض' قابلِ ذکر ہیں۔

عبداللہ ولی بخش قادری لکھتے ہیں:

'ان کی شاعری میں ان کی زندگی کا پرتو صاف جھلکتا ہے ان کی طبیعت تصنع اور تکلفات سے دور بھاگتی ہے۔ وہ منکسر المزاجی اور دوست نواز واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اپنے ہم عصر شعراء کہتر و مہتر کی تخصیص کے بغیر جگہ بہ جگہ جلوہ گر نظر آتے ہیں......'

دلاور فگار کو زبان پر دسترس ہے اور فطری شاعر ہیں ذرا سی بات میں کئی باتیں کہہ جانے کا ہنر جانتے ہیں وہ اپنی شاعری میں زندگی کے مضحک پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کسی بغض یا عناد کو دخل نہیں بلکہ اس میں نیک نیتی اور بالغ نظری ہوتی ہے۔ ان کے طنز میں تہہ داری ملتی ہے جو پردہ بھی ہے اور پروردہ بھی ہے۔

دلاور فگار 1998ء میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔

آج کا اسٹوڈنٹ

میں اسٹوڈنٹ ہوں سارے جہاں سے میرا ناتا ہے
مری تقدیر کا کھاتا، عجب اندھیر کھاتا ہے
تنزل باپ ہے میرا، جہالت میری ماتا ہے
زمانہ میری بربادی پہ کیوں، آنسو بہاتا ہے

میں اپنے وقت کا سب سے بڑا فرہاد مجنوں ہوں
مجھے دیکھو کہ میں کیا ہوں یہ مت سوچو کہ میں کیوں ہوں

مری صورت ہے نورانی، مرا حلیہ ہے جاپانی
مری بدھی ہے یونانی، مری فطرت ہے رومانی
مری قسمت میں لکھی ہے درجاناں کی دربانی
میں پروانہ سنیما کا ثریا میری پروانی

سرِ بازار بھی میں دل کا گولہ پھینک سکتا ہوں
جمالِ یار کی گرمی سے آنکھیں سینک سکتا ہوں

میں ہر ذلت کو اپنے حق میں اک اعزاز سمجھتا ہوں
میں ہر گھوڑے کو ٹٹو، ہر ہرن کو خر سمجھتا ہوں
میں اپنے ایگریکلچر ہی کو کلچر سمجھتا ہوں
میں ہر بھتنی کو شہناز و پری پیکر سمجھتا ہوں

میں سن سرسٹھ کے ہر پکچر کی ہیروئین پہ مرتا ہوں
محبت میرا پیشہ ہے، یہ بزنس میں بھی کرتا ہوں

مری نالج نہ پوچھو میرا ہر مضمون ہی انڈا ہے
مرا سوزِدروں، جذب دروں مدت سے ٹھنڈا ہے
مرے ہاتھوں میں اب تو جنگ آزادی کا جھنڈا ہے
سیاست میری گلی ہے، الیکشن میرا ڈنڈا ہے

میں اب نیتا بنوں گا، قوم کو رستہ دکھاؤں گا
بہت کچھ بن چکا اُلو، اب اوروں کو بناؤں گا

میں یو این او کو امریکہ کا اک صوبہ سمجھتا ہوں
الزابتھ کو سرسید کی محبوبہ سمجھتا ہوں
اگر لکھا ہو فطلوبہ تو مطلوبہ سمجھتا ہوں
نہ میں ہندی سمجھتا ہوں نہ منصوبہ سمجھتا ہوں

لکھا ہے ض سے زیتون و زنجیر و ذکی میں نے
کیا ہے ترجمہ خوش قسمتی کا گڈلکی میں نے

ہمیشہ امتحاں میں فیل ہونا میری عادت ہے
مری کوشش سے قائم فیل ہونے کی روایت ہے
اگر میں پاس ہوجاؤں تو کالج سے بغاوت ہے
میں جس کالج میں پڑھتا ہوں مجھے اس سے محبت ہے

کوئی بھی امتحاں ہو فیل ہونا میری ہابی ہے
مری ناکامیابی درحقیقت کامیابی ہے

میں جب چھوٹا تھا ہر ہر ماسٹر سے مار کھاتا تھا
دبا کر اپنی دم کالج سے اکثر بھاگ جاتا تھا
مجھے پڑھنا نہ آئے گا، نہ آتا ہے، نہ آتا تھا

میں اکثر اپنے درجہ ہی میں فلمی گیت گاتا تھا
اسی درجہ میں اب بھی تازہ فلمی گیت گاتا ہوں
بریلی کے بڑے بازار میں جھمکا گراتا ہوں

بڑی مشکل سے آپایا ہوں میں دسویں سے انٹر تک
نہیں تھا امتحاں میں یاد مجھ کو رول نمبر تک
لکھوں تو کیا لکھوں آتی نہیں مجھ کو گرامر تک
یہ عالم ہے کہ پڑھ سکتا نہیں انگلیش پیپر تک
سوالِ لازمی کا آنسر فی الفور کیا لکھوں
بجز اس کے کہ گھر پر خیریت ہے اور کیا لکھوں

مرا دل تنگ ہے کیمسٹری کے فارمولوں سے
طبیعت بھر گئی ہے، ارتھمیٹک کے اصولوں سے
کہاں تک دل کو بہلاؤں میں ان کاغذ کے پھولوں سے
یہ عالم لوگ بھی کچھ کم نہیں سوکھے ببولوں سے
انھی کے جال میں بے سوچے سمجھے پھنس گیا ہوں میں
مجھے باہر نکالو، اک کنوئیں میں دھنس گیا ہوں میں

الفاظ و معنی

اسٹوڈنٹ	۔	طالب علم
فطرت	۔	عادت
بدھی	۔	عقل
جمال	۔	حسن، خوب صورتی
ذلت	۔	بے عزتی، رسوائی

نالج ۔ معلومات

کلچر ۔ تہذیب

ایگریکلچر ۔ زراعت، بیج لگانا

نورانی ۔ روشن، چمکتا ہوا

آبر ۔ عزت

درِ جاناں ۔ محبوب کا دروازہ

جال ۔ پھندا

حلیہ ۔ شکل وشباہت، شکل وصورت

آپ نے پڑھا

☐ اس نظم میں دلاور فگار نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں آج کے اسٹوڈنٹ کا حلیہ بیان کیا ہے۔ جسے نہ تو ماں باپ کی عزت کی فکر ہوتی ہے نہ اپنے مستقبل کی۔ یہاں تک کہ وہ امتحان میں فیل ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنے اساتذہ کا عزت واحترام کیا جانیں بس فلمی ہیرو ئنوں پر مرنا اور ادھر ادھر مارے پھرنا ان کی ہابی ہے۔ کسی سبجیکٹ کو پڑھنے میں ان کا دل نہیں لگتا۔ کالج جانا ان کے لیے ایک تفریح ہے۔

آپ بتائیے

1. دلاور فگار کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) لکھنؤ (ب) الہ آباد (ج) عظیم آباد (د) بدایوں

2. دلاور فگار نے کس سن میں میٹرک پاس کیا؟

(الف) 1940ء (ب) 1942ء (ج) 1948ء (د) 1956ء

3. دلاور فگار کے والد کا نام کیا تھا؟

(الف) شاکر حسین (ب) ذاکر حسین (ج) غالب حسین (د) ناصر حسین

4. آج کا اسٹوڈنٹ یو این او کو بقول شاعر کیا سمجھتا ہے؟

(الف) امریکہ کا ایک صوبہ (ب) افریقہ کا ایک صوبہ (ج) انگلینڈ کا ایک صوبہ (د) چین کا ایک صوبہ

5. لفظوں کو صحیح معنی سے ملایئے۔

ذلت	حساب
خصلت	روشنی
نور	فطرت
نالج	رسوائی
ارتھمیٹک	معلومات

مختصر گفتگو

1. دلاور فگار کے دو مجموعوں کا نام لکھیے۔
2. دلاور فگار کا شعری مجموعہ 'حادثے' کب شائع ہوا؟
3. دلاور فگار کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟
4. اس مصرعے کو پورا کیجیے۔

الٹا بتھ کو سرسید کی .... سمجھتا ہوں

5. جمع بنایئے۔

وظیفہ، جوہر، عمل، تحفہ، قدم، عادت

تفصیلی گفتگو

1. نظم کا مرکزی خیال بتایئے۔
2. دلاور فگار کے بارے میں دس جملے لکھیے۔
3. آج کا اسٹوڈنٹ کالج جانا کیا سمجھتے ہیں؟
4. درج ذیل الفاظ کی ضد بتایئے۔

دوستی، سچ، خیر، قلیل، مشکل، نیکی، سکون

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد سے کچھ اور مزاح نگاروں کا نام پوچھ کر لکھیے۔
2. دلاور فگار سے متعلق کتابوں کو لائبریری سے نکلوا کر پڑھیے۔

سبرامنیم بھارتی

سبرامنیم بھارتی 11 دسمبر 1882 ایٹار پورم ترونا ولی ضلع تامل ناڈو میں پیدا ہوئے۔ ایٹار پورم ایک چھوٹی سی زمینداری تھی، جہاں کے زمیندار مہاراجہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ بھارتی کے والد چنا سوامی ایر زمینداری میں ایک چھوٹے پس ماندہ عہدے دار تھے۔ سبرامنیم بھارتی ان کی پہلی اولاد تھے جو کہ ماں کے پیار سے بچپن ہی میں محروم ہو گئے تھے۔ ان کو پڑھائی لکھائی سے دلچسپی نہ تھی وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنے نانا جن کو تامل زبان وادب سے بڑی گہری دلچسپی تھی، انھی کے ساتھ گزارتے تھے۔ سبرامنیم دس سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔

پندرہ سال کی عمر میں سبرامنیم بھارتی کی شادی چلماں سے کردی گئی۔ اب یہ ایٹار پورم میں ہی رہنے لگے تھے۔ اور اپنی خداداد ذہانت اور اپنی شاعری سے بہت جلد سارے ماحول پر چھا گئے۔ زمیندار نے ان کی شاعری سے متاثر ہو کر انھیں بھارتی کے لقب سے نوازا۔ اب وہ بھارتی کہلانے لگے۔ کم عمری میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ بھارتی اپنے خالہ خالو کے پاس بنارس چلے گئے جہاں الہ آباد یونی ورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔

بھارتی نے اپنی شاعری کی بنیاد ان سیاسی عوامل پر رکھی جن سے ہندوستان کا بچہ بچہ متاثر تھا روزنامے کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے بھارتی کو ہندوستان کے سیاسی حالات کا بخوبی علم تھا۔ ان کے دو شعری مجموعے 'سودیش گیدنگل' 1908ء اور 'جنم بھومی' 1909ء میں شائع ہوئے۔ 19 ستمبر 1921ء کو مختصر علالت کے بعد اس انقلابی شاعر سبرامنیم کا انتقال ہو گیا۔

نظم

سبرامنیم بھارتی / مترجم : حسرت سہروردی

نغمۂ آزادی

یہ لمحہ رقص و سرود کا ہے
آخر مسرت سے بھری آزادی
ہمارے قبضے میں آ ہی گئی
ذات پات پر فخر کرنے کا دور ختم ہو گیا
بدیسی طاقت کا بھرم کھل گیا
بدیسی حکومت کے ہر اشارے پر
رقص کرنے کا دور چلا گیا

جادوگر کی جادوگری کا طلسم ٹوٹ گیا
آزادی بین الاقوامیت کی زبان ہے
اور مساوات تجربہ کاروں کا حسن
آج ہم آزادی کا شنکھ پھونکیں گے
اور حقیقت کا برملا اظہار کریں گے
ہم پر یہ حقیقت کھل گئی ہے
کہ سب کی پیدائش
ایک ہی طرح سے ہوتی ہے
چھوت اور دغا موت کے گھاٹ اتر گئے
وہی لوگ عظیم ہیں جو اچھے ہیں

تخریب بڑے لوگوں پر غالب آ گئی ہے
ہل جوتنے والے کسان، کاریگروں کی قدر کرو
کام چوروں اور کاہلوں پر لعنت بھیجو
ہم بنجر زمین کو پانی نہیں دیں گے
اور کاہلوں کے لیے اپنا خون پسینہ نہیں کریں گے
ہم جان گئے ہیں کہ یہ زمین ہماری اپنی ہے
اور ہمیشہ اپنی ہی رہے گی
کوئی بھی غیر ملکی طاقت
ہمیں غلام نہیں بنا سکتی
ہم بھگوان کی دیا سے بہت آگے بڑھیں گے

لفظ و معنی

بدیشی	۔	غیر ملکی
رقص	۔	ناچ
مساوات	۔	برابری
برملا	۔	کھلم کھلا
دغا	۔	دھوکہ
طلسم	۔	جادو
مسرت	۔	خوشی
بنجر زمین	۔	وہ زمین جس میں پیداوار نہ ہو
کاہل	۔	سست
دیا	۔	مہربانی
سرود	۔	گانا بجانا

دور - زمانہ

آپ نے پڑھا

- یہ نظم سبرامنیم بھارتی کی تامل زبان کی نظم کا اردو ترجمہ ہے۔ اس نظم کا ترجمہ حسرت سہروردی نے کیا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں آزادی کا گیت گایا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد اس نظم کی تخلیق ہوئی تھی۔ جس میں حصولِ آزادی کے تاریخی موقع پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا گیا ہے اور مستقبل میں اچھے اور خوش حال ہندوستان کا تصور پیش کیا گیا ہے، نیز ملک سے تمام خرابیوں کو دور کردینے کا عہد بھی کیا گیا ہے۔

آپ بتائیے

1. سبرامنیم بھارتی کی پیدائش کب ہوئی؟
2. سبرامنیم بھارتی کی بیوی کا کیا نام تھا؟
3. سبرامنیم بھارتی کا تعلق ہندوستان کے کس صوبے سے تھا؟
4. سبرامنیم کو بھارتی کا لقب کس نے عطا کیا؟
5. زیرِ نصاب نظم کے اردو مترجم کا نام بتائیے۔

مختصر گفتگو

1. سبرامنیم بھارتی کا خاندانی پس منظر مختصراً بیان کیجیے۔
2. تامل زبان کی شاعری پر پانچ جملے لکھیے۔
3. ایک شاعر کی حیثیت سے سبرامنیم کی شاعری کا انقلابی پہلو بیان کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1. سبرامنیم بھارتی کی شخصیت سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. نظم 'نغمۂ آزادی' کا مرکزی خیال پیش کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے منظوم اردو ترجمہ کرنے والے شعرا کی ایک فہرست تیار کیجیے ساتھ ہی اردو میں وطنی شاعری کا جائزہ لیجیے۔

قصیدہ

قصیدہ اس صنفِ شاعری کو کہتے ہیں جس میں کسی کی مدح یا ہجو میں اشعار کہے جاتے ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی اور پوری نظم غزل ہی کی طرح ہی قافیہ اور ردیف کی پابند ہوتی ہے۔ قصیدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تمہیدیہ اور دوسری خطابیہ۔ تمہیدیہ وہ قصیدہ ہے جس میں کسی کی تعریف اور توصیف بیان کرنے سے پہلے عشق و محبت اور اسی طرح کے دوسرے مضامین پر مشتمل اشعار لکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اصل مقصد کی طرف شاعر رجوع ہوتا ہے جبکہ خطابیہ وہ قصیدہ ہے جس میں تمہید نہیں ہوتی بلکہ کسی کی تعریف یا کسی کی تنقیص ابتدا سے شروع کر دی جاتی ہے۔

قصیدہ کے پانچ ارکان ہیں:

۱۔ تشبیب، ۲۔ گریز، ۳۔ مدح یا ہجو (عرض حال)، ۴۔ حسن طلب، ۵۔ دعائیہ کلام

قصیدہ میں الفاظ کی شان و شوکت، تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع اور مبالغہ کا استعمال بہت ہوتا ہے۔

اردو قصیدہ نگاروں میں سودا، ذوق، غالب اور فراق کا کوری قابل ذکر ہیں۔

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

ذوقؔ کا اصل نام شیخ محمد ابراہیم تھا اور ذوقؔ تخلص رکھتے تھے آپ کی پیدائش 23 اگست 1790ء مطابق 11 ذی الحجہ 1204ھ سوموار کے دن دلی میں ہوئی۔ ذوقؔ دلی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے آپ نے ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول کے مکتب میں حاصل کی۔ انہی کی صحبت میں شاعری کا شوق پیدا ہوا جب سن شعور کو پہنچے تو غزلیں کہنے لگے اور شاہ نصیرؔ کی شاگردی اختیار کی اور ان سے غزلوں میں اصلاح لینے لگے لیکن کچھ دنوں کے بعد اصلاح کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اور مشاعروں میں بے تکلف غزلیں پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ 15۔16 سال کی عمر میں ایک دیوان تیار ہوگیا۔ 20 سال کی عمر میں کلام پر وہ قدرت حاصل ہوگئی کہ لوگ انہیں استاد تسلیم کرنے لگے۔

رفتہ رفتہ مغلیہ دربار میں ذوقؔ کی بھی رسائی ہوگئی اور وہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر بھی شاعری کرتے تھے اور استاد ذوقؔ سے شاعری میں اصلاح لیتے تھے۔

شیخ ابراہیم ذوقؔ کو بہت سے علوم سے واقفیت تھی۔ شاعری کے علاوہ علم تفسیر اور تصوف میں کامل عبور رکھتے تھے۔ نوجوانی میں موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ علم نجوم و رمل سے بھی خاطر خواہ واقفیت تھی۔ علم طب میں بھی مہارت رکھتے تھے لیکن اس علم کو کبھی پیشے کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ مغلیہ دربار سے ذوقؔ کو 'خاقانی ہند' کا خطاب ملا۔

مختصر سی علالت کے بعد 16 نومبر 1854ء مطابق 24 صفر 1271ھ جمعرات کے دن صبح آپ کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر 64 سال تھی۔ موت سے تین گھنٹے قبل ذوقؔ نے یہ شعر کیا ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع
کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسمان

نہ آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر
جس طرح کوہسار سے بالا تر آسمان

خطبہ کے واسطے ترے نام بلند کے
گر مشتری خطیب ہو تو منبر آسمان

وہ بحر بیکراں ہے تری ہمت وسیع
ہے بلبلہ سا ایک کنارے پہ آسمان

دریائے قہر تیرا جو طوفاں کرے بپا
بہہ جائے مثلِ کشتیِ بے لنگر آسمان

قد پر ترے وہ راست قبائے علوئے جاہ
زیبندہ جس کے واسطے بالا بر آسمان

تیری گہر فشانیِ دست کرم سے ہے
گویا کہ ایک دامن پر گوہر آسمان

چمکائے تیغ تیز کو اقبال کر تیرا
ہو مصقلہ ہلال تو صیقل گر آسمان

یوں دل میں تیرے جلوہ ذات محیط حق
آجائے جیسے آئینہ کے اندر آسمان

سرعت میں ترا رخش فلک سیر کیا شہاب
رفعت میں بھی ہے پیل جبل پیکر آسمان

شاہا عجب نہیں ترے شبدیز کے لیے
ہووا کے ماہ نو سے رکاب زر آسمان

انجم ہیں کیا شرر ترے نالے سمند کے
ہے بلکہ ترا گردِ رہِ لشکر آسمان

مانا اگر بلندیِ شان و شکوہ میں
ہاتھی سے ترے ہو بھی گیا ہمسر آسمان

پر اس کے نقش پا کے مقابل بنا سکے
چار آفتاب ایک جگہ کیوں کر آسمان

یہ ذوق کی دعا ہے کہ جب تک زمانہ میں
منسوب ہر ستارے سے ہووے ہر آسمان

بزمِ نشاط و عیش رہے تیرے گھر میں روز
لائے ہمیشہ تیری مرادیں بر آسمان

مارے جگر میں حاسد بدخواہ کے ترے
تار خطوط مہر سے سو نشتر آسمان

الفاظ و معنی

طالع	۔	قسمت
مساعد	۔	مددگار، ہمدرد
مطیع	۔	فرمانبردار
کوکب	۔	ستارہ
یاور	۔	مددگار
کوہسار	۔	پہاڑ
مشتری	۔	ایک تارے کا نام
خطیب	۔	خطبہ دینے والا
بحرِ بیکراں	۔	بے انتہا سمندر
قبا	۔	لباس
زیبندہ	۔	خوبصورت لگنے والا
تیغ	۔	تلوار
ہلال	۔	پہلی تاریخ کا چاند
محیط	۔	احاطہ کیے ہوئے
سرعت	۔	تیزی
رخش	۔	رستم کے گھوڑے کا نام ہے
رفعت	۔	بلندی
جبل پیکر	۔	پہاڑ جیسا جسم
سدا	۔	ہمیشہ
ہمسر	۔	برابر
بزم	۔	محفل
بدخواہ	۔	بُرا چاہنے والا

آپ نے پڑھا

- زیر نصاب قصیدہ شیخ ابراہیم ذوق کی تخلیق ہے۔
- ابراہیم ذوق مغلیہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا درباری شاعر تھا۔ ساتھ ہی بہادر شاہ ظفر کا استاد بھی تھا۔
- پیش نظر قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی شان میں لکھا گیا ہے۔
- اس قصیدہ میں شاعر نے اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے اس کے شاندار مستقبل کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔
- ذوق کے اس قصیدہ کا شمار اردو کے بہترین قصیدوں میں ہوتا ہے۔ اس قصیدے میں شاعر نے نہ صرف یہ کہ اپنے ممدوح بہادر شاہ ظفر کی اقبال مندی کی دعائیں کی ہیں بلکہ ممدوح کے دشمنوں اور بدخواہوں کی مذمت بھی کی ہے۔

آپ بتائیے

1. ذوقؔ کا پورا نام کیا ہے؟
2. ذوقؔ کی پیدائش کب ہوئی؟
3. ذوقؔ کس بادشاہ کے استاد تھے؟
4. کس شاعر سے ذوقؔ نے اصلاح لی؟

مختصر گفتگو

1. ذوقؔ کے حالات مختصراً بیان کیجیے۔
2. فن قصیدہ کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔
3. ذوقؔ کی قصیدہ نگاری پر پانچ جملے لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

1. قصیدہ کے آغاز وارتقا پر ایک مضمون لکھیے۔
2. ذوقؔ کی قصیدہ گوئی کا جائزہ لیجیے۔
3. زیر نصاب قصیدہ کا مفہوم بیان کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے اردو کے قصیدہ نگار شعراء کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

مرثیہ

مرثیہ عربی لفظ رثا سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں کسی کی موت پر رونا۔ مرثیہ اصناف شاعری میں اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی تعریف کی گئی ہو اور اس کی موت پر اظہار غم کیا گیا ہو۔ جب اس لفظ کا استعمال ہوا تو اس وقت صرف شخصی مرثیے موجود تھے۔ سانحۂ کربلا سے متعلق جو بھی مرثیے لکھے گئے بعد کو لکھے گئے۔ اور اردو میں اس کا رواج اتنا عام ہوا کہ مرثیہ کا ذکر آئے تو ذہن شخصی مرثیے کی طرف نہیں بلکہ کربلائی مرثیے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس طرح مرثیہ کی دو قسمیں قرار دی جاتی ہیں: (ا) شخصی مرثیہ (۲) مرثیہ

اردو مرثیے کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں:

چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت، بین

مرثیہ ہماری شاعری کی وہ صنف ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ اس نے اردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ اردو کے مشہور ترین مرثیہ نگار میر انیس اور مرزا دبیر ہیں۔

مرزا سلامت علی دبیر

مرزا دبیر کا اصل نام مرزا سلامت علی اور دبیر تخلص تھا۔ والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ دبیر کی پیدائش 1903ء میں دہلی کے محلہ بلی ماران میں ہوئی۔ سات سال کی عمر میں دبیر اپنے والدین کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ دبیر کی تعلیم کی ابتدا دلی میں ہو چکی تھی اور شاعری سے بھی دلچسپی ہونے لگی تھی درسی کتابوں سے فارغ ہو کر لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول سے متاثر ہوئے اور شعر موزوں کرنے لگے اور میر ضمیر سے اپنے کلام میں اصلاح لینے لگے۔ دبیر کے لیے استاد میر ضمیر، روشن ضمیر ثابت ہوئے اور مرثیہ نگاری میں مرزا دبیر نے استادی کا مقام حاصل کر لیا۔ نوعمر شاعر پسند عام اور مقبولیت کے ذریعہ بہت جلد شہرت حاصل کر لیتا ہے۔ پندرہ بیس سال کی عمر میں ہی مرزا دبیر شاعری کے منبر پر آنے لگے۔ اور پیش خوانی و مرثیہ خوانی میں اپنا بہترین کلام سنانے لگے۔ طبیعت میں روانی و برجستگی تھی عمر کے ساتھ ساتھ مشق میں اضافہ ہوتا گیا۔ مشق کو محنت نے جلا دی اور میر انیس کے مقابلے میں کلام پڑھنے لگے۔ چنانچہ اردو شاعری خصوصاً مرثیہ نگاری کی تاریخ میں انیس و دبیر کی شاعرانہ چشمک بہت مشہور ہے۔

اردو مرثیہ نگاری میں دبیر کی شہرت اور استادی کا یہ عالم تھا کہ اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے برصغیر کے دور دراز شہروں، قریوں اور دیہاتوں میں دبیر کا سکہ چلتا تھا۔ مشہور تھا کہ بین اور مرثیت میں دبیر کا جواب نہیں۔ سوز خواں انھیں کے مرثیے پڑھتے تھے عورتیں انہیں کا کلام پسند کرتی تھیں۔

مرثیہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہونے کی وجہ شہرت اور علاج کی غرض سے دبیر نے کئی طویل سفر بھی کیے اور کلکتہ بھی گئے۔ سفر کلکتہ کے دوران عظیم آباد بھی تشریف لائے۔ دبیر کا یہ سفر عظیم آباد کی ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

آخر کار 6 رمارچ 1875ء کو اردو مرثیہ کا یہ برگزیدہ شاعر لکھنؤ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ آپ جہاں مدفون ہوئے وہ آج کوچۂ دبیر کہلاتا ہے۔

بیان شہادت حضرت حُر

ہر سنگ بنا لعل و گہر مہر علی سے　　پارس نمط آہن ہوا زر مہر علی سے
روشن ہوئے خورشید و قمر مہر علی سے　　ہے گردش اختر میں اثر مہر علی سے
گل خاک سے اور لعل ہوئے سنگ سے پیدا
اس مہر کا ہے فیض ہر اک رنگ سے پیدا

ہر سنگ کو یاقوت کیا مہر علی نے　　قطرے کو شرف دُر کا دیا مہر علی نے
بخشی مہ و انجم کو ضیا مہر علی نے　　خورشید کو بیعت میں لیا مہر علی نے
قطرے سے گہر، خار سے گل ہوتے ہیں پیدا
صدقے سے علی کے جزوکل ہوتے ہیں پیدا

لو مومنو، حُر لشکر کفار سے نکلا　　یہ نور وہی نور ہے جو نار سے نکلا
یاقوت چمکتا ہوا کہسار سے نکلا　　دیں کفر سے، چاند ابر سے، گل خار سے نکلا
یہ شاہ ولایت کی ہدایت کا اثر ہے
حُر رات کو گمراہ تھا اس وقت خضر ہے

کیا آمد جبریل ہے مرغوب نبی کو　　اب تک نہیں یہ آرزوئے عید کسی کو
کیا آمد سلماں ہے پسندیدہ علی کو　　تفریح عجب ہوتی تھی احمد کے وصی کو
دیکھو تو ہراول کے خط لوح جبیں کو
اب ہے یہ خوشی آمد حُر کی شہ دیں کو

آواز مبارک کا ہے غل فوج خدا میں　　آمد ہے ہراول کی سپاہ شہداء میں
تقریب ملاقات ہے سلطان و گدا میں　　مصروف ہے حُر شکریہ رب ھدیٰ میں
حق پشت پہ، بخت اوج پہ، اقبال کمک پر
سر شاہ کی تسلیم میں اور پاؤں فلک پر

جنت میں جہنم سے خدا لاتا ہے حُر کو جلوہ حق و باطل کا نظر آتا ہے حُر کو
تحسین خدا عرش پہ فرماتا ہے حُر کو رضواں بھی چمن خلد کا دکھلاتا ہے حُر کو
حُر نام ہے کیوں شہ کے غلاموں میں تو حُر ہے
داخل ہے غلاموں میں جہنم سے یہ حُر ہے

جبریل صفت وحی خدا کو نہیں لایا پر حُر بھی ہے اللہ کا بھیجا ہوا آیا
گر وحی نہیں پائی تو الہام ہے پایا واں سدرہ کا سایہ، یہاں زہرہ کا ہے سایہ
جبریل امیں یہ نہیں پر سدرہ نشیں ہے
رضواں نہیں پر مالک فردوس بریں ہے

سلمان کا اور حُر کا شرف ایک ہے پریاں پہلے تھا غلام ایک یہودی کا وہ ذی شاں
پر، دے کے یہودی کو زرو قیمت سلماں سلماں کو پیمبر نے لیا اور دیا ایماں
اللہ رے شرف حُر سعید ازلی کا
یہ بندۂ بے زر ہے حسین ابن علی کا

ہیں دست کشادہ پئے حُر سید آفاق یعقوب ہم آغوشی یوسف کا ہے مشتاق
خورشید کو ذرے کی جدائی ہوئی ہے شاق واں کوشش طاعت ہے یہاں جوشش اخلاق
دریا کی طرف چاہ تو قطرے کی عیاں ہے
یاں بحر امامت بھی سوئے قطرہ رواں ہے

لفظ و معنی

سنگ ۔ پتھر
لعل و گہر ۔ ہیرا اور موتی
شہادت ۔ خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے جان دینا
حُر ۔ آزاد، میدان کربلا میں ایک نیک شخص کا نام ہے۔
آہن ۔ لوہا
نمط ۔ رنگین فرش یا بچھونا
خورشید ۔ سورج

- چاند

ردش اختر - ستارے کی گردش

س - فائدہ

ف - عزت

س - ایک ہیرے کا نام

رت - ایک ہیرے کا نام

و انجم - چاند اور تارے

ء - روشنی

ں - پھول

ر - کانٹا

عید - نیک بخت

ل - ہمیشہ

یاں - ظاہر

ر امامت - امامت کا سمندر

واں - چلتا ہوا

اعت - فرمانبرداری

اق - صدمہ، ناقابلِ برداشت

شتاق - شوقین

ست کشادہ - پھیلا ہوا ہاتھ

بے زر - بغیر روپیہ کا

ی شان - شان والا

ندرہ - ساتویں آسمان کے اوپر ایک درخت کا نام ہے

حسین - تعریف

لد - جنت

رضوان	۔	داروغۂ جنت کا نام ہے
پشت	۔	پیٹھ
بخت	۔	تقدیر
اوج	۔	ترقی
فلک	۔	آسمان
لوحِ جبیں	۔	پیشانی کی تختی
مرغوب	۔	پسندیدہ

آپ نے پڑھا

☐ اردو مرثیہ کے ارتقا میں مرزا سلامت علی دبیر کی خدمات قابل قدر ہیں۔ یہ مرثیہ میدان کربلا سے متعلق ہے۔
مرثیہ میں ایک نیک روح 'حُر' کی شخصیت کو ابھارا گیا ہے۔ مرثیہ نگار مرزا دبیر نے اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے
ایمان نعمت خداوندی ہے اور خدا جس کو جس وقت ہدایت دے دے۔ اس ضمن میں حُر خوش قسمت تھا کہ آیا تھا
کی فوج میں اور عین وقت پر خدا نے اسے ہدایت دی اور میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی فوج میں شامل
شہادت کا عظیم درجہ پایا۔

آپ بتایئے

1. دبیرؔ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. دبیرؔ کے والد کا کیا نام تھا؟
3. دبیرؔ کس صنف شاعری کے لیے مشہور ہیں؟
4. دبیرؔ کس مشہور شاعر کے ہم عصر رہے ہیں؟
5. دبیرؔ کی وفات کب ہوئی؟

مختصر گفتگو

1. فن مرثیہ کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
2. دبیرؔ کے دلی سے لکھنو آنے کا مختصر احوال بیان کیجیے۔

3. حُر کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔

4. زیرِ نصاب مرثیہ میں شہ دین سے کیا مراد ہے؟ مختصراً تحریر کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1. فنِ مرثیہ کی ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

2. مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری پر روشنی ڈالیے۔

3. زیرِ نصاب مرثیہ کا مرکزی خیال پیش کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد سے واقعات کربلا اور شہادت امام حسینؓ کے بارے میں واقفیت حاصل کریں۔

2. طلبہ کے ساتھ مل کر میدان کربلا، یزیدی افواج اور حُر کی شخصیت پر ایک مذاکرہ منعقد کیجیے۔

شاد عظیم آبادی

شاد عظیم آبادی کا پورا نام سید علی محمد تھا۔ شادؔ تخلص کرتے تھے۔ خان بہادر خطاب تھا۔ شاد کی پیدائش اپنے نانیہال پٹنہ (عظیم آباد) کے محلہ پورب دروازہ میں جنوری 1846 میں ہوئی۔ والد کا نام سید عباس مرزا تھا جو عظیم آباد کے عالی خاندان اور رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں شاد کے مکتب کی ابتدا ہوئی اس کے بعد اپنے دادیہال محلہ حاجی گنج چلے آئے۔ یہ خاندان بھی عظیم آباد میں معزز و ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ نو سال کی عمر میں شاد نے عربی پڑھنا شروع کیا شاد کے اساتذہ میں وزیر علی عبرتی کا نام لیا جاتا ہے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد شاد اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس وقت کے استاد شاعر سید شاہ الفت حسین فریاد سے اصلاح لینے لگے۔ فریاد کی شاگردی پر شاد کو فخر تھا۔

آپ کے علمی کمالات اور اعلیٰ ادبی خدمات کے صلہ میں برٹش گورنمنٹ نے آپ کو 1889 میں 'خان بہادر' کے خطاب سے نوازا۔ 8 رجنوری 1927 کو 81 سال کی عمر میں شاد عظیم آبادی کا انتقال ہوگیا۔

شاد کا شمار اردو کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ بحیثیت غزل گو بھی ان کا شمار چند منتخب غزل نگاروں میں ہوتا ہے جب کہ شاد کے مراثی غزلوں کے علاوہ ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو ثابت کرنے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ کلیم الدین احمد جیسے ناقد نے اردو شاعری کی مثلیث میں میرؔ اور غالبؔ کے ساتھ شادؔ کو بھی شامل کیا ہے۔ شاد کا شاعرانہ تفکر حیات و کائنات کی تفہیم سے متعلق ہے۔ جس میں تصوف کی تہہ داریاں اور عمومی زندگی کی روشیں شامل ہیں لیکن ان کے برتاؤ میں شاد کے یہاں الفاظ کی نشست و برخاست عمومیت نہیں رکھتی بلکہ وہ ان کے استعمال میں ایک ایسی جدلیاتی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ سب کے سب معنی آفرینی کی نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر شہر عظیم آباد کو شاعری کا ایک دبستان تسلیم کرلیا جائے تو اس دبستان کے سب سے بلند قامت شاعر شاد عظیم آبادی ہی ہوسکتے ہیں۔

رخصت حضرت عباسؑ علم بردار

بچوں کو لیے سامنے تھی زوجۂ عباس   تھا گود میں ایک، ایک تھا دامن سے لگا پاس
سن سن کے یہ تقریر ہوئی جاتی تھی بے آس   بچوں کی طرف دیکھتی جاتی تھی بصد یاس
شوہر کی جو باتوں کی طرف جان لڑی تھی
آنکھوں سے رواں اشک تھے حیران کھڑی تھی

رو رو کے پسر نے جو بصد درد یہ پوچھا   کچھ کہیے تو للہ کدھر جاتے ہیں بابا
کیوں روتی ہیں اماں مرا دل ہے تہ و بالا   منہ چوم کے ماں کہتی ہے گھبراؤ نہ بیٹا
دریا کی طرف مشک کے بھرنے کو چلے ہیں
صدقے گئی مجبور ہیں مرنے کو چلے ہیں

کُرتے کو کرو چاک، یتیمی کا دن آیا   ماں صدقے، اٹھا جاتا ہے اب باپ کا سایہ
تقدیر نے کس سخت مصیبت میں پھنسایا   قسمت نے تمھیں داغ یتیمی کا دکھایا
ہم لوگ گرفتار بلا ہوتے ہیں واری
چلا کے نہ رونا، وہ خفا ہوتے ہیں واری

کانوں میں جو آنے لگی آہستہ یہ آواز   بچوں کی طرف بڑھ گئے عباس سرافراز
اس طرح سے کہنے لگا زوجہ سے وہ جاں باز   ہر طرح سے خالق نے کیا ہے تمھیں ممتاز
رو رو کے شکایت نہ کرو ظلم و جفا کی
تم بھی تو کنیزوں ہی میں ہو آلِ عبا کی

بالفرض سمجھ لو کہ اجل نے ہمیں مارا   مرضی یہی اس کی ہے تو کیا اس میں اجارا
دس سال شب و روز رہا ساتھ تمہارا   کیا کیجیے قسمت کو نہیں اب یہ گوارا
تم ہو کے گرفتار پھنسو قید محن میں
ہم سوئیں قیامت تلک اس اجڑے ہوئے بن میں

لفظ و معنی

علم بردار	۔	جھنڈا اٹھانے والا
زوجہ	۔	بیوی
یاس	۔	مایوسی
اشک	۔	آنسو
بصد درد	۔	سیکڑوں درد کے ساتھ
مشک	۔	پانی بھرنے کے لیے چمڑے کا تھیلا
چاک	۔	پھاڑنا
جانباز	۔	جان لڑانے والا
خالق	۔	پیدا کرنے والا
بالفرض	۔	مان لیا کہ
اجل	۔	موت
محن	۔	محنت کی جمع یعنی مصیبت
بن	۔	جنگل

آپ نے پڑھا

- گذشتہ صفحات میں آپ نے شاد عظیم آبادی کے ایک مرثیے کے پانچ بند پڑھے۔ ان بندوں میں حضرت عباسؓ کے میدان جنگ میں جاتے ہوئے رخصت ہونے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ حضرت عباسؓ کربلا میں حسینی لشکر کے علم بردار تھے۔

آپ بتایئے

1. شاد عظیم آبادی کا اصل نام کیا تھا؟
2. شاد کے استاد کا کیا نام تھا؟
3. شاد عظیم آبادی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

4. شاد کا انتقال کب ہوا؟

5. شاد کا دادیہال کہاں تھا؟

ضر گفتگو

1. اس مرثیہ میں کہاں کا منظر پیش کیا گیا ہے؟

2. مرثیے کے اجزائے ترکیبی سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

3. مرثیے کے پہلے بند کا مفہوم بیان کیجیے۔

نصیلی گفتگو

1. شاد عظیم آبادی کی شاعری پر ایک مضمون قلمبند کریں۔

2. شاد کی مرثیہ نگاری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

یئے، کچھ کریں

1. کلاس میں اپنے استاد سے واقعات کربلا کے بارے میں دریافت کیجیے۔

غزل

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف ہے۔ اردو میں غزل فارسی سے آئی ہے مگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صنف غزل کا آغاز سب سے پہلے عربی شاعری میں ہوا۔ عربی میں لکھے ہوئے طویل قصیدوں کے ابتدائی تمہیدی حصوں جن میں زیادہ تر عشق ومحبت کی باتیں ہوتی تھیں، 'غزل' کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شاعری کی ایک الگ صنف بن گئی اور فار کے شاعروں نے اس میں زیادہ سے زیادہ رنگینیاں بھر دیں۔ یہاں تک کہ اردو میں بھی ابتدا میں اس کا یہی رنگ اور مز رہا۔ اور لغت (ڈکشنری) میں اب تک اس کے معنی 'عورتوں سے باتیں کرنا' لکھے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ اردو غزل میں ا مضامین کی کوئی قید نہیں ہے اور حسن وعشق کے ساتھ ساتھ تصوف، اخلاق، فلسفہ، مسائل حیات اور سائنسی حقائق تک ب کیے جاتے ہیں۔ گویا کہ اب اس کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو غزل وہ صنف شاعری ہے جس کا ہر شعر معنی کے اعتبار سے الگ مگر قافیہ، ردیف وزن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہا جاتا ہے۔ اس کے دونوں مصرعے ہم ق اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اگر ایک کے بعد دوسرا مطلع بھی لکھا جائے تو وہ حسن مطلع کہلاتا ہے۔ باقی اشعار کے ص دوسرے مصرع میں قافیہ اور ردیف کا استعمال ہوتا ہے۔ بعض غزلوں میں ردیف نہیں ہوتی، انہیں 'غیر مردّف غزل' کہا ہے۔ غزل کے آخری شعر کو جس میں شاعر اپنا قلمی نام یا تخلص استعمال کرتا ہے 'مقطع' کہا جاتا ہے۔ غزل میں اشعار کی ت متعین نہیں ہے۔ ویسے عام طور سے پانچ، سات، نو، گیارہ یا پندرہ اشعار کی غزلیں کہی جاتی ہیں۔ غزل کے اشعار میں کبھی خیالات کا تسلسل بھی ملتا ہے یعنی تمام اشعار ایک ہی طرح کے جذبات یا خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ اس طرح غزلوں کو 'غزل مسلسل' کہا جاتا ہے۔

اردو میں غزل گوئی کا آغاز امیر خسرو سے مانا جاتا ہے۔ گرچہ ان کی صرف ایک غزل موجود ہے جو فارسی اور زبان کا ملا جلا نمونہ ہے۔ اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ، ولی، فائز، میر، درد، راسخ، غالب، ذوق، مومن، آتش، شاد، حس جگر، فانی، اقبال، اور فراق سے لے کر کلیم عاجز تک اردو شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے اپنے انداز میں غزلیں ہیں۔ گزشتہ چالیس پچاس برسوں کے دوران ہندی میں بھی غزل کہنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور وہاں کچھ اچھے غزل گ سامنے آئے ہیں۔

فائز دہلوی

فائز کو مشہور غزل گو شاعر ولی کا ہم عصر مانا جاتا ہے۔ جس زمانے میں ولی نے جنوبی ہند میں اردو غزل کی شمع جلائی تھی، فائز نے شمالی ہند میں اردو شاعری کا چراغ روشن کیا تھا۔ وہ اپنے انفرادی انداز کے سبب ممتاز ہوئے۔

فائز کے خاندانی حالات ایک عرصے تک معلوم نہیں ہو سکے تھے۔ گذشتہ صدی میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی اور دوسرے لوگوں کی تحقیق سے جو باتیں سامنے آئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا نام صدر الدین محمد خاں تھا اور فائز تخلص۔ ان کے والد نواب زبردست خاں شاہی منصب دار تھے جو پہلے ناظم اودھ رہے اور پھر پنجاب اور اجمیر کے صوبہ دار بنے۔ خاندان کے دوسرے افراد بھی اعلیٰ عہدوں پر تھے مگر اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کی جو حالت ہوئی اس سے فائز کا خاندان بھی متاثر ہوا۔ جاگیریں تو زیادہ تر ختم ہو گئیں، کچھ دولت ضرور باقی رہی جس سے انہیں ایک خوش حال اور باوقار زندگی گزارنے میں مدد ملی۔

فائز کا انتقال 1738ء میں دہلی میں ہوا۔ ان کی صحیح تاریخ پیدائش اب تک طے نہیں ہو سکی ہے مگر مختلف شہادتوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ 1679ء کے آس پاس پیدا ہوئے تھے۔ یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ ایک ذی علم شخص تھے۔ اور انہیں ادب کے علاوہ دینیات، فلسفہ، طب، ریاضی، منطق وغیرہ سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے تقریباً بیس تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

فائز کا دیوان 1714ء کے قریب مرتب ہوا تھا جس میں زیادہ تر نظمیں ہیں۔ کچھ غزلیں بھی ہیں جن میں سے کل 33 غزلیں ایسی ہیں جو ولی کی طرحوں میں لکھی گئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ولی سے متاثر تھے۔ ویسے فائز کی غزلوں یا نظموں میں ان کے علم و فضل کے اثرات بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح کی زندگی انہوں نے بسر کی اس کا اثر ان کی شاعری پر نمایاں ہے۔ ان کی غزلیں زیادہ تر 'غزل مسلسل' کے زمرے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ ان میں زیادہ گہرائی یا فکر و فلسفہ نہیں ہے بلکہ عشقیہ جذبات کا سیدھا سادا بیان ہے۔ اس عہد کے شاعروں میں ایہام گوئی کا بھی چلن تھا مگر فائز اس سے دور رہے۔

فائز دھلوی

(۱)

جان! ایام دلبری ہے یاد — سیر گلزار مے خوری ہے یاد
دیکھتا تھیں سورج کو نظراں بھر — کس کوں تجھ جامۂ زری ہے یاد
وہ تماشاد کھیل ہولی کا — سب کے تن رخت کیسری ہے یاد
وہ چراغاں و چاندنی کی رات — سیر ہٹ پھول و پھلجھڑی ہے یاد
جب تمن پاس فائز آیا تھا
بات کہنا بی سرسری ہے یاد

(۲)

اے خوب رو فرشتہ صفت انجمن میں آ — سرو روان حسن ہمارے چمن میں آ
موںہہ باندھ کر کلی سا نہ رہ میرے پاس تو — خنداں ہوکر کے گل کی صفت ٹک سخن میں آ
عشاق جاں بکف ہیں کھڑے تیرے آس پاس — اے دل ربائے غارت جاں اپنے فن میں آ
دوری نہ کر کنار سوں میری تو اے ہما — کب لگ رہے گا دور ٹک اپنے وطن میں آ
تیرے ملاپ بن نہیں فائز کے دل کو چین
جیوں روح ہو بسا ہے تو اس کے بدن میں آ

الفاظ و معنی

ایام	۔	دن، زمانہ (یوم کی جمع)
گلزار	۔	باغ، چمن
مے خوری	۔	شراب پینا، 'مے خواری' کی جگہ استعمال ہوا ہے۔
نکیں	۔	نہیں کے لیے استعمال ہوا ہے
رخت	۔	لباس، پوشاک، سامان
کیسری	۔	زعفرانی، زرد
زری	۔	سنہری، سونے کا تار
جامہ	۔	کپڑا، پوشاک
بی	۔	بھی کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسے 'نکیں' یا 'نیں'، 'ہ' کو ہٹا کر نہیں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
خوب رو	۔	خوب صورت، حسین، اچھی شکل والا
خنداں	۔	ہنستا ہوا، شگفتہ، کھِلا ہوا
مونہہ	۔	دکنی شعرا کی طرح فائزؔ بھی کبھی پیش کی حرکت ظاہر کے لیے 'و' استعمال کرتے ہیں۔ جیسے 'بہت' کی جگہ 'بہوت'، یہاں 'منہ' سے 'مونہہ' ہو گیا ہے۔
ٹک	۔	ذرا
کب لگ	۔	کب تک کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بہار اور یوپی کے بعض دیہاتوں میں آج بھی لفظ 'لگ' رائج ہے۔
روح ہو ہے	۔	'کر' بیچ سے غائب ہے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ جس طرح روح ہو کر بسے ہو اسی طرح جسم میں بھی آ جاؤ۔
ہما	۔	ایک چڑیا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ جس کے سر سے گذر جاتی ہے، وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔
اپنے فن میں آ	۔	اپنا کام کر۔ اپنا ہنر دکھا
سخن میں آ	۔	باتیں کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی تو خاموش نہ رہ بلکہ باتیں کر۔

آپ نے پڑھا

- آپ نے فائزؔ دہلوی کی دو غزلیں پڑھیں۔ ان غزلوں میں ایک خاص زمانے کا اندازِ بیان موجود ہے جب اردو زبان ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اس لیے بعض الفاظ اس طرح نہیں لکھے ہوئے ہیں جیسے اب لکھے جاتے ہیں۔
- ان دونوں غزلوں میں فائزؔ کے جذبات کا سیدھے سادے انداز میں بیان ہوا ہے۔ فکر و فلسفہ کی کوئی گہرائی نہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ شاعر پہ گذری ہے اس کو شاعر پیش کر رہا ہے۔ کسی گذرے ہوئے زمانے کی یاد ہے جس کو شاعر تازہ کرنا چاہتا ہے اور پھر یہ بھی چاہتا ہے کہ اسکا محبوب دوبارہ اس کے ساتھ رہے۔ دونوں ہی غزلوں کو غور سے پڑھیے تو خوب صورت تصویریں نظر کے سامنے ابھرتی ہیں۔

- پہلی غزل میں گذری ہوئی یادوں کا ایک سلسلہ ہے۔ شاعر کو پرانے دن یاد آتے ہیں جب وہ اپنے محبوب کے ساتھ تھا۔ وہ باغ کی سیر کرتے تھے اور خوشی کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ یہ ایسا زمانہ تھا جب شاید ہولی کا تیوہار تھا اور رنگوں کے سبب سبھوں کے لباس زرد یا زعفرانی رنگ کے ہو گئے تھے۔ شاعر ان چاندنی راتوں کو بھی یاد کرتا ہے جو اس نے محبوب کے ساتھ گزاری تھیں اور پھر وہ کھیل تماشے، وہ پھلجڑیاں اور سیر سپاٹا۔ شاعر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کے محبوب کا سنہرا لباس اور اس کی سج دھج ایسی تھی کہ جو اسے ایک بار دیکھ لے وہ کبھی سورج کے حسن سے بھی متاثر نہ ہو۔
- دوسری غزل میں بھی عشقیہ جذبات کا بیان ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ وصال کا منظر اب جدائی کے منظر میں بدل گیا ہے۔ اب شاعر کا محبوب دور ہے اور وہ اس کے پاس آنے کی تمنا کر رہا ہے۔ چونکہ بغیر اس کے زندگی ایسی ہی ہے جیسے روح کے بغیر انسانی جسم ہوتا ہے، بے جان اور مردہ۔ یہاں بے قراری کا اظہار ہے مگر محبوب کی تعریف بھی ساتھ ساتھ ہے۔
- ان دونوں غزلوں کے مطالعے سے آپ کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ غزل کا جو روایتی رنگ رہا ہے یعنی حسن و عشق سے تعلق رکھنے والی باتوں کا اظہار، وہ یہاں موجود ہے۔

آپ بتائیے

1. شاعر نے ان غزلوں میں کس کو مخاطب کیا ہے اور کس سے باتیں کی ہیں؟
2. شاعر کو گذرے ہوئے زمانے کی کون سی باتیں یاد آ رہی ہیں؟
3. خوب رو، فرشتہ صفت، دل ربا، غارت جاں وغیرہ کس کو کہا گیا ہے؟
4. شاعر نے اپنے محبوب کو کن کن ناموں اور خطابوں سے یاد کیا ہے؟
5. ہما کیا ہے؟ اور لوگ عام طور پر اس کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟
6. پہلی اور دوسری غزل میں آپ کے خیال سے کیا فرق ہے؟

مختصر گفتگو

1. فائز کہاں کے رہنے والے تھے؟

(الف) لکھنؤ (ب) دہلی (ج) پٹنہ (د) دکن

2. فائزؔ کا انتقال کب ہوا؟

(الف) 1730ء (ب) 1738ء (ج) 1837ء (د) 1783ء

3. فائزؔ کے بارے میں کس نے تحقیق کی؟

(الف) سید مسعود حسین خاں (ب) سید مسعود حسن رضوی

(ج) سید احتشام حسین (د) وہاب اشرفی

1. فائزؔ کس صدی عیسوی کے شاعر تھے؟

(الف) سولہویں (ب) سترہویں (ج) اٹھارہویں (د) انیسویں

1. شاعر کے مطابق ہولی میں سب کے لباس کس رنگ کے ہو جاتے ہیں؟

(الف) کالے (ب) کیسری (ج) سفید (د) لال

تفصیلی گفتگو

1. فائزؔ کی غزل گوئی کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون لکھیے۔
2. فائزؔ کی غزلوں میں کس طرح کے جذبات کا بیان ہوا ہے؟ سمجھا کر لکھیے۔
3. فائزؔ کے حالاتِ زندگی پر مختصراً روشنی ڈالیے۔
4. وہ تماشا و کھیل ہولی کا سب کے تن رختِ کیسری ہے یاد

درج بالا شعر کی اپنے الفاظ میں تشریح کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے معلوم کریں کہ فائزؔ جس زمانے کے شاعر ہیں وہ زمانہ کیسا تھا؟
2. اپنے اسکول یا علاقے کی کسی لائبریری میں جا کر فائزؔ کا مجموعۂ کلام تلاش کیجیے اور اس کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری یا کاپی میں نقل کیجیے۔
3. اپنے استاد سے فائزؔ کی زبان اور غزل گوئی کے بارے میں کچھ اور باتیں دریافت کیجیے۔

درد

خواجہ میر نام اور درد تخلص ہے۔ دہلی میں 1721 میں پیدا ہوئے اور 1785 میں انتقال ہوا۔ ان کے آباواجداد اورنگ زیب کے عہد میں بخارا سے دہلی آئے تھے۔ درد کو تصوف اور علم وادب کا شوق وراثت میں ملا۔ ان کے بزرگوں کا تعلق تصوف کے نقشبندیہ سلسلے سے تھا۔ والد خواجہ محمد ناصر فارسی کے اچھے شاعر تھے اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ درد نے بھی شعر گوئی کا آغاز فارسی زبان میں کیا اور بعد میں اردو کی طرف توجہ کی۔ درد نے شاعری کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور ابتدائے عمر سے ہی تصنیف وتالیف کی طرف مائل رہے اور کئی رسالے اپنی یادگار چھوڑے جو فارسی زبان میں ہیں۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب 'آبِ حیات' میں لکھا ہے کہ انہوں نے صرف پندرہ برس کی عمر میں ہی پہلا رسالہ لکھا۔ مشہور ہے کہ اکیس برس کی عمر سے ہی انہوں نے فقیرانہ لباس زیب تن کرلیا مگر ساری عمر دین و دنیا دونوں سے تعلق رکھا۔ شادی بھی کی اور دنیاوی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ شرعی طور زندگی گزاری مگر نہ کبھی کسی دربار سے وابستہ ہوئے نہ غیر ضروری مدح سرائی کی۔

خواجہ میر درد کا ایک دیوان فارسی اور دوسرا اردو میں ہے۔ ان کی غزلیں زیادہ طویل نہیں ہوتیں۔ عام طور پر پانچ سات یا نو اشعار لکھے ہیں۔ تصوف سے قربت کے سبب ان کے خیالات میں سنجیدگی، متانت اور دردمندی ہے۔ سوز وگداز کی بھی کمی نہیں۔ کلام میں بے حد روانی اور آمد ہے۔ انداز بیان عام طور پر سیدھا سادہ اور سلیس ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے دل پر عشق الٰہی کے سبب جو کچھ گذرتی ہے اسے اشعار میں بیان کردیتے ہیں۔ ان کا شمار اردو کے ایسے صوفی شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے تصوف اور عشق حقیقی کو کلام کے ساتھ ساتھ زندگی کا بھی حصہ بنایا ہے۔ اردو شاعری میں تصوف کی پیش کش آپ نے جس خوب صورتی کے ساتھ کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

خواجہ میر درد

(۱)

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے   جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں   چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
جوں شرر اے ہستیِ بے بود یاں   بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

(۲)

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا   برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ   کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں   ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں   کبھو تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بے گانگی میں   کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
حجاب رخِ یار تھے آپ ہی ہم   کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا
شب و روز اے دردؔ درپے ہو اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

لفظ و معنی

تہمت	۔	الزام، بہتان
مانند	۔	جیسا، مطابق، ہو بہو
بزم	۔	محفل، مجلس، سبھا
چشم	۔	آنکھ
شرر	۔	آگ کی چنگاری
بارے	۔	لیکن، آخر
ہستی بے بود	۔	بے وجود، ایسی ہستی جس کی کوئی وقعت نہ ہو
تلک	۔	تک
جلوہ	۔	نظارہ، صورت، نمائش کرنا
دل گرفتہ	۔	غمگین، مغموم، عاشق
کسو	۔	'کسی' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اردو کے ابتدائی دور میں یہ انداز تھا۔
کبھو	۔	'کبھی' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اردو کے ابتدائی دور میں یہ انداز تھا۔
اذیت	۔	دکھ، تکلیف
سرو چراغاں	۔	سرو ایک درخت ہے جو سیدھا مخروطی شکل کا ہوتا ہے۔ سرو چراغاں سے مراد وہ جھاڑ ہے جو سرو کی طرح ہوتا تھا اور محفلوں میں روشن کیا جاتا تھا۔
یگانہ	۔	بے مثال، بے نظیر، واحد، اکیلا
حجاب	۔	پردا
شب و روز	۔	رات دن
رخ یار	۔	دوست کا چہرہ، محبوب کا چہرہ

آپ نے پڑھا

- آپ نے درد کی دو غزلیں پڑھیں۔ درد جس زمانے کے شاعر تھے اس میں غزل گوئی کا ایک رجحان عشق حقیقی یا تصوف کا بھی تھا جس سے درد بھی تعلق رکھتے تھے۔

- دردؔ ایک صوفی تھے اور ان کے دل میں اللہ اور اس کے بندوں کی محبت بھری ہوئی تھی۔ اس محبت اور دردمندی کا درد کی غزلوں میں کھل کر اظہار ہوا ہے۔
- صوفی کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات ہی اصل ہے اور باقی ساری چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مگر دنیا کی ہر شئے میں اس کے بنانے والے یعنی اللہ کا جلوہ موجود ہے انسان دنیا میں رہتا ہے تو خدا کا جلوہ دیکھنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ اس کا وجود ایک ایسے قطرے کی طرح ہے جو دریا (یعنی اپنے اصل) سے ملنے کے لیے بے قرار ہو۔ اگر وہ اللہ سے نہ مل سکے تو اس کی ہستی بے معنی ہے۔ اور اللہ سے وصال ہی اس کے لیے راحت کا سبب ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو دردؔ نے ان غزلوں میں الگ الگ انداز سے بیان کی ہیں۔ انداز بیان بہت سادہ اور رواں ہے۔
- پہلی غزل میں دردؔ نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اپنی آمد کے مقصد کو بھول جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں پھنس کر چند الزامات اپنے سر لے لیتا ہے اور ناپائیدار دنیا سے رخصت ہوتے وقت گناہوں کا شکار ہو کر جاتا ہے۔ دوسری غزل میں شاعر نے عشق الٰہی کی مختلف کیفیتوں کو پیش کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ایک سچے عاشق (صوفی) کی اپنے محبوب (اللہ) سے جدائی کے سبب کیا حالت ہوتی ہے۔
- دردؔ کی ان غزلوں میں ان کے صوفی ہونے کے اثرات نمایاں ہیں۔

آپ بتائیے

1. شاعر نے ان غزلوں میں کس کی باتیں کی ہیں اور کس کو مخاطب کیا ہے؟
2. عشق مجازی اور عشق حقیقی کا کیا مطلب ہے؟ دردؔ کے یہاں عشق کی کون سی صورت موجود ہے؟
3. 'تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا' ۔ یہ بات شاعر نے کس کے لیے کہی ہے اور کیوں کہی ہے؟
4. 'حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم'۔ اس مصرع کا کیا مطلب ہے؟
5. کون سی ایسی ذات ہے جس کی مثال ملنی ناممکن ہے؟
6. پہلی اور دوسری غزل میں آپ کے خیال سے کوئی فرق ہے یا نہیں؟
7. دردؔ کی غزلوں کا انداز بیان کیسا ہوتا ہے؟

مختصر گفتگو

1. دردؔ کا تعلق تصوف کے کس سلسلے سے تھا؟

(الف) فردوسیہ　(ب) چشتیہ　(ج) نقشبندیہ　(د) ان میں سے کوئی نہیں

2. دردؔ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) دہلی　(ب) پٹنہ　(ج) لکھنؤ　(د) بخارا

3. دردؔ نے کتنے برس کی عمر میں پہلا رسالہ تصنیف کیا؟

(الف) پندرہ　(ب) بیس　(ج) پچاس　(د) ساٹھ

1. دردؔ کی شاعری اردو کے علاوہ اور کس زبان میں ہے؟

(الف) عربی　(ب) فارسی　(ج) ترکی　(د) انگریزی

1. دردؔ کے اسلاف کہاں سے دہلی آئے تھے؟

(الف) افغانستان　(ب) ترکی　(ج) بخارا　(د) پاکستان

تفصیلی گفتگو

1. دردؔ کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات مختصراً لکھیے۔
2. دردؔ کے حالات زندگی چند جملوں میں لکھیے۔
3. دردؔ کی کسی ایک غزل کے تین اشعار اپنی یادداشت سے لکھیے۔
4. دردؔ کے درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا　برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استادوں یا دوستوں سے تصوف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں۔
2. دردؔ کی جو غزلیں آپ کے نصاب میں ہیں، ان کے علاوہ کوئی غزل تلاش کرکے اپنی کاپی پر نوٹ کیجیے۔
3. دردؔ کے زمانے میں جو دوسرے شعرا غزلیں کہہ رہے تھے ان کا نام اپنے استاد سے پوچھیے۔

اقبالؔ

شیخ محمد اقبال نام اور اقبالؔ تخلص تھا۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ ان کے آبا و اجداد کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک خانوادے سے تھا جس نے ایک مسلمان بزرگ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا۔

اقبالؔ 1877ء میں سیالکوٹ (ضلع لاہور، موجودہ پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ اردو کے علاوہ سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے واقفیت حاصل کی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد کچھ دنوں اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ پڑھاتے رہے۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے جہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ پھر جرمنی سے ایرانی تصوف کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انگلینڈ میں اسلام کے موضوع پر کچھ لکچر دیے اور لندن یونی ورسٹی میں کچھ ماہ تک عربی کا درس دیتے رہے۔ جولائی 1908ء میں لاہور واپس آئے اور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی مگر کچھ دنوں بعد یہ کام چھوڑ دیا۔ اپریل 1938ء میں طویل علالت کے بعد وفات پائی اور لاہور میں مزار بنا۔ حکومت نے زندگی میں ہی 'سر' کا اور عوام نے ان کی زبردست علمی و ادبی صلاحیت اور خدمات کی بنیاد پر 'علامہ' کا خطاب دیا۔

اقبالؔ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی شاعری کے مجموعے اردو میں 'بانگِ درا'، 'بالِ جبریل'، 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ فارسی میں 'پیامِ مشرق' اور 'اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی' ان کے مجموعے ہیں۔ ایک اہم کتاب 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' بھی ہے۔

اقبالؔ ایک ایسے شاعر ہیں جن کا کلام اردو کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی شائع ہوا ہے اور اب تک ترجمہ ہو رہا ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق سیکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور نئے نئے زاویوں سے ان کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود ان کے بارے میں عام طور سے یہ مانا جاتا ہے کہ وہ صرف شاعر نہیں تھے بلکہ قوم کی اصلاح کرنے کا جذبہ بھی دل میں رکھتے تھے اور وطن کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ان کی شاعری میں فکر و فلسفہ کی جو گہرائی ہے اس کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ شاعری کے وسیلے سے پیغام دینا چاہتے تھے۔ ان کی نظموں میں یہ صورت زیادہ نمایاں ہے مگر غزلیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے غزل گوئی میں بھی اقبالؔ کا ایک منفرد انداز ہے۔ خاص طور پر 'بالِ جبریل' کی غزلوں میں فکر و فلسفہ اور پیغامِ عمل کے ساتھ فنی حسن کا جو نمونہ ملتا ہے وہ بے مثال ہے۔

اقبال

(۱)

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

(۲)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

لفظ و معنی

حقیقتِ منتظر	۔	وہ سچائی جس کا انتظار کیا جائے
لباس	۔	کپڑا، جامہ
مجاز	۔	حقیقت کے برعکس، جس کی اصلیت نہ ہو، یہاں مراد دنیاوی ہے۔
جبین	۔	پیشانی، ماتھا
نیاز	۔	آرزو، تمنا، حاجت، التجا، انکسار، عاجزی، مسکینی
شکستہ	۔	ٹوٹا ہوا، خراب اور بے رونق
آئینہ ساز	۔	شیشہ بنانے والا، آئینہ گر
عفو	۔	معافی، بخشش
بندہ نواز	۔	غلام کو عزت دینے والا، مالک، مختار، حاکم
غزنوی	۔	غزنی کا رہنے والا، سلطان محمود غزنوی کے لیے کنایہ کے طور پر آیا ہے۔
ایاز	۔	بادشاہ محمود کے غلام کا نام تھا۔
سر بہ سجدہ ہونا	۔	سجدے میں سر رکھنا، سر جھکانا
صدا	۔	آواز
صنم	۔	بت، مورتی، دل بر، معشوق
جہاں	۔	دنیا
قناعت	۔	تھوڑی چیز پر راضی ہونا، جو مل جائے اس پر خوش رہنا، صبر
عالم رنگ و بو	۔	رنگ و بو کی دنیا، ہماری دنیا سے مراد ہے
نشیمن	۔	آشیانہ، گھونسلا
مقامات	۔	جگہیں
آہ و فغاں	۔	رونا پیٹنا، نالہ و فریاد، واویلا کرنا
شاہین	۔	ایک سفید رنگ کا شکاری پرندہ جو آسمان میں اونچا اڑتا ہے اور گھونسلا نہیں بناتا۔
پرواز	۔	اڑان

روز و شب - دن رات

زماں و مکاں - وقت اور جگہ

آپ نے پڑھا

- آپ نے علامہ اقبالؔ کی دو غزلیں پڑھیں۔ جن کا انداز آپ کو عام غزلوں کے مزاج سے کچھ الگ لگا ہوگا۔
- اقبالؔ ایک ایسے شاعر ہیں جن کو کبھی فلسفی شاعر اور کبھی مصلح قوم یعنی قوم کو سدھارنے والا کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبالؔ نے شاعری سے پیمبری کا کام لیا ہے اور قوم کو راستہ دکھانے کا کام کیا ہے۔ ان دونوں غزلوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ اقبال نے عشقیہ جذبات یا واردات نہیں پیش کیے ہیں بلکہ ایک فلسفی اور مفکر کی طرح اظہار خیال کیا ہے۔
- پہلی غزل کا مطلع بہت مشہور رہا ہے۔ اسے یاد کر لیجیے۔ اس پوری غزل میں اقبال نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ عشق الٰہی کی راہ میں کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں اور ان پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے۔ سجدہ اگر خلوص سے ادا نہ کیا جائے، عبادت اگر سچے دل سے نہ کی جائے تو بے کار ہے۔ یہی اقبال کا پیغام ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اب حسن اور عشق دونوں کا انداز بدل گیا ہے اور یہ صورت حال ان کو بے چین کر دیتی ہے۔
- دوسری غزل کا مطلع بھی بہت مشہور ہے اور بہت سارے مواقع پر دہرایا جاتا ہے۔ اس پوری غزل میں اقبال نے حرکت و عمل کا پیغام دیا ہے اور یہ احساس دلانا چاہا ہے کہ ایک کے بعد ایک منزل کی طرف بڑھتے جانا ہی کامیاب لوگوں کی پہچان ہے۔
- دوسری غزل پہلی غزل کے مقابلے میں زیادہ سہل اور رواں انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہاں اقبال نے اپنے پسندیدہ پرندے 'شاہین' کی بڑائی بھی ایک شعر میں ظاہر کی ہے اور قوم کے نوجوانوں کو اس سے سبق لینے کی صلاح دی ہے۔

آپ بتائیے

1. شاعر اقبالؔ نے اپنی غزلوں میں کس کو مخاطب کیا ہے؟
2. اقبالؔ کی غزلوں کا انداز دوسرے شاعروں سے الگ کیوں ہے؟
3. اقبالؔ کی غزل گوئی کا عام مزاج کیا ہے؟
4. 'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'۔ اس مصرع کا کیا مطلب ہے؟

5. اقبالؔ اپنی غزلوں میں فکر وفلسفہ سے کیوں کام لیتے ہیں، عشقیہ مضامین کیوں نہیں بیان کرتے؟
6. سجدہ کرنے والوں کوکس طرح سجدہ کرنا چاہیے کہ ان کی نماز قبول ہو؟
7. غزنویؔ اور ایازؔ کا تذکرہ کرکے اقبال نے کس کی طرف اشارہ کیا ہے؟

مختصر گفتگو

1. اقبالؔ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) دہلی (ب) سیالکوٹ (ج) پانی پت (د) کراچی

2. اقبالؔ کا انتقال کب ہوا؟

(الف)1930ء (ب)1935ء (ج)1938ء (د) 1947ء

3. اقبالؔ انگلینڈ کیوں گئے تھے؟

(الف) اعلیٰ تعلیم کے لیے (ب) نوکری کرنے کے لیے
(ج) سیر وتفریح کرنے کے لیے (د) ان میں سے کوئی نہیں

4. اقبالؔ کا مزار کہاں ہے؟

(الف) کراچی (ب) لاہور (ج) اسلام آباد (د) ملتان

5. اقبالؔ کے دو مجموعہ کلام کا نام بتایئے۔

تفصیلی گفتگو

1. اقبالؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات مختصراً لکھیے۔
2. اقبالؔ کو شاعر مشرق کیوں کہا جاتا ہے؟
3. اقبالؔ کی شاعری میں عشقیہ باتیں کیوں نہیں رہتی ہیں؟
4. اقبالؔ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔
5. اقبالؔ کے اس شعر کی تشریح کیجیے۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

4. اقبالؔ نے نوجوانوں کو شاہیں بننے کا مشورہ کیوں دیا؟ سمجھا کر لکھیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے اقبالؔ کے بارے میں مزید معلومات فراہم کریں۔
2. اپنے اسکول یا علاقے کی لائبریری میں اقبال کی شاعری کے مجموعے تلاش کریں اور ان کا مطالعہ کریں۔
3. پتہ کریں کہ اقبالؔ کی نظم 'ہمالہ' اور 'نیا شوالہ' ان کے کس مجموعے میں ہے؟
4. اقبالؔ کی کوئی اور غزل یاد کریں اور دوستوں کے ساتھ مل کر اس کی صدابندی کریں۔

جمیل مظہری

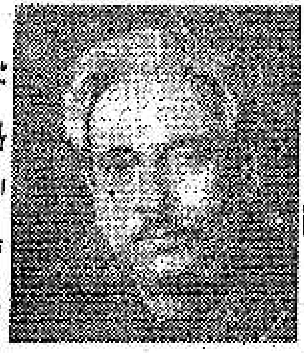

جمیل مظہری کا اصل نام میر کاظم علی تھا۔ وہ ستمبر 1904ء میں محلہ مغل پورہ پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سیٹی میں حاصل کی اور 1922ء میں تال تلہ ہائی اسکول کلکتہ سے میٹرک پاس کیا۔ کلکتہ سے ہی ایم۔اے پاس کرنے کے بعد پٹنہ میں پبلسٹی افسر مقرر ہوئے۔ 1942ء کی 'ہندوستان چھوڑو تحریک' میں شامل ہوکر استعفیٰ دے دیا۔ اور گرفتار ہوئے۔ رہائی کے بعد کچھ دنوں بمبئی کی فلموں میں گانے لکھے اور 1950ء سے پٹنہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں استاد ہوگئے جہاں سے دسمبر 1974ء میں ریٹائر ہوکر اپنے چھوٹے بھائی رضا مظہری کے ساتھ کلکتہ میں رہنے لگے۔ پٹنہ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ 23/جولائی 1980ء کو کھیکن پور (ضلع مظفر پور) میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

جمیل مظہری کی پہلی نظم 'مالن کی بیٹی' تھی جو 1942ء کے آس پاس شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے شاعری کی مختلف صنفوں مثلاً غزل، نظم، مرثیہ، مثنوی، رباعی اور قطعہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان کے مختلف اداروں سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہیں 1974ء میں اردو ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں 'غالب ایوارڈ' حاصل ہوا۔ ملک کی مختلف اردو اکادمیوں سے بھی انعامات و اعزازات ملے۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ 'فکر جمیل' کے نام سے پہلی بار 1956ء میں پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ ان کی شاعری اور شخصیت سے متعلق بہت ساری کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ وہ ایک اہم دانشور اور شاعر تھے۔

جمیل مظہری کی غزل گوئی میں عشقیہ جذبات کی پیش کش بہت کم ہے۔ ان کا مزاج فکری اور فلسفیانہ ہے جسے اقبال سے قریب کہا جاسکتا ہے۔ ان کی بعض غزلیں بے حد مشہور رہی ہیں اور ان کے انفرادی رنگ سخن کی آئینہ دار ہیں۔

ان کی غزل گوئی کے بارے میں اردو کے مشہور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ رائے قابل توجہ ہے:

> '......ایک معصومیت اور حیرت یہ ہوتی ہے کہ انسان دنیا کو دیکھتا ہے، سمجھتا ہے اور تب یہ سوچتا ہے کہ یہ کارخانہ کتنا عظیم الشان ہے اور اس کے پیچھے کیا کیا عوامل کارفرما ہیں؟ جمیل مظہری کا ذہن اسی حیرت اور اضطراب کا آئینہ ہے۔ خاص طور پر ان کی غزل اسی کا آئینہ ہے۔'

جمیل مظہری کے شعری مجموعے 'نقش جمیل'، 'عکس جمیل'، 'آثار جمیل' اور 'عرفان جمیل' وغیرہ کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی مثنوی 'آب و سراب' بھی بہت مشہور ہے۔ انہوں نے نثر نگاری بھی کی ہے۔

جمیل مظہری

(۱)

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں، بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر، پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں، یہی نہ معنی ہے اس کے واعظ
وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو مکان جلتا ہو جب کسی کا

بس ایک احساس نارسائی، نہ جوش اس میں نہ ہوش اس کو
جنوں پہ حالت ربودگی کی، خرد پہ عالم غنودگی کا

جمیلؔ حیرت میں ہے زمانہ، مرے تغزل کی مفلسی پر
نہ جذبۂ اجتبائے رضویؔ، نہ کیف پرویز شاہدیؔ کا

(۲)

صبح خود بتائے گی، تیرگی کہاں جائے
یہ چراغ کی جھوٹی روشنی کہاں جائے

جو نشیب آئے گا راستہ دکھائے گا
موڑ خود بتائے گا آدمی کہاں جائے

ہاؤ ہو کی دنیا میں، ماؤ تو کی دنیا میں
رنگ و بو کی دنیا میں سادگی کہاں جائے

بے تعلقی مسلک ہوچکا ہے دنیا کا
دوستی کہاں جائے، دشمنی کہاں جائے

اب تو دھوپ آ پہنچی جھاڑیوں کے اندر بھی
اب پناہ لینے کو تیرگی کہاں جائے

بڑھ کے دو قدم تو ہی اس کی پیٹھ ہلکی کر
یہ تھکا مسافر اے رہزنی کہاں جائے

زخم دل تو کیا دوگے داغ سجدہ ہی دے دو
اب تمہاری چوکھٹ سے مظہریؔ کہاں جائے

لفظ و معنی

پیمانہ	۔	ناپنے کا آلہ، پلڑا، ترازو
تخیل	۔	قیاس، تصور، خیال، سوچ
سُرور	۔	فرحت، خوشی، نشہ، خمار
فریب	۔	دھوکا
پیہم	۔	لگاتار
سرِراہ	۔	راستے میں
واعظ	۔	نصیحت کرنے والا، وعظ کہنے والا
منتظر	۔	انتظار کرنے والا، امیدوار، آس لگانے والا
رسائی	۔	پہنچ، دخل، گذر، اس کا الٹا نارسائی ہوتا ہے۔
جنوں	۔	دیوانگی، کسی چیز کی دھن، سودا
ربودگی	۔	غنودگی یا غفلت جو بیمار کو ہوتی ہے
خرد	۔	عقل
غنودگی	۔	اونگھ، نیند، خمار، نشہ
تغزل	۔	غزل گوئی، عشقیہ مضامین بیان کرنا
مفلسی	۔	غریبی، ناداری، محتاجی
اعجاز رضوی	۔	جمیل مظہری کے ہم عصر ایک مشہور شاعر
پرویز شاہدی	۔	جمیل مظہری کے ہم عصر ایک مشہور ترقی پسند شاعر
تیرگی	۔	تاریکی، سیاہی، اندھیرا
نشیب	۔	پستی، گہرائی، ڈھلان
ہاؤ ہو	۔	شور وہنگامہ، آہ آہ، ہائے ہائے، درد اور کراہنے کی آواز
ما و تو	۔	میں اور تم
مسلک	۔	راہ، راستہ، طریقہ، قاعدہ، دستور
رہزنی	۔	لوٹ پاٹ، ڈکیتی

آپ نے پڑھا

- آپ نے جمیل مظہری کی دو غزلیں گذشتہ صفحات میں پڑھی ہیں۔ ان غزلوں کا رنگ عام عشقیہ غزلوں سے کچھ الگ ہے۔ ان میں کچھ فکر ہے، کچھ فلسفہ ہے۔ یہی جمیل مظہری کی غزل گوئی کا مزاج ہے۔
- جمیل مظہری کی پہلی غزل کا مطلع بے حد مشہور رہا ہے۔ اس میں جمیل مظہری نے ایک عجیب و غریب نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ اہم سمجھتا ہے اور کسی نہ کسی طرح سے خود کو ممتاز مانتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مسلسل دھوکا ہے چونکہ انسان جتنا بھی بڑا ہو مگر بے وقعت ہے۔ جس کے سوچنے کا پیمانہ جس قدر چھوٹا یا بڑا ہے وہ اتنا ہی اس دھوکے میں مبتلا ہے۔
- غزل کے دوسرے اشعار کا رنگ بھی فلسفیانہ ہے۔ اس میں بھی ایک سچائی کا اظہار ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں پر طنز بھی ہے جو خود کچھ جدوجہد کرنے کی جگہ صرف تقدیر کے بھروسے رہتے ہیں۔ اس نکتے کو جمیل مظہری نے اس طرح سمجھایا ہے کہ اگر آگ لگ جائے تو اسے بجھانے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ صرف خدا کی رحمت کے انتظار میں یہ سوچ کر کھڑا رہنا چاہیے کہ وہ بارش بھیج دے گا اور پانی سے آگ سرد ہو جائے گی۔
- پہلی غزل کے مقطع میں جمیل مظہری نے اپنی غزل گوئی کے منفرد مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے زمانے کے دو اہم شاعروں پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی سے اپنا مقابلہ کیا ہے اور انکساری سے کام لیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ نہ تو ان کے یہاں رضوی کی طرح جذبات کی فراوانی ہے نہ پرویز کی طرح کیف ہے۔
- دوسری غزل بھی فکر اور فلسفہ سے بھری ہوئی ہے۔ خاص طور پر پانچواں شعر جمیل مظہری کے مخصوص مزاج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس پر اقبال کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پہلی غزل کے مقابلے میں دوسری غزل کا انداز بیان سادہ اور عام فہم ہے۔

آپ بتائیے

1. جمیل مظہری کی کون غزل آپ کو زیادہ پسند آئی اور کیوں؟
2. جمیل مظہری کی ان غزلوں میں کیا خاص بات ہے جو انھیں دوسرے غزل گو شاعروں سے الگ کرتی ہے؟
3. جمیل مظہری کی غزلوں کے اور کون سے اشعار آپ کو یاد ہیں۔ اگر نہیں یاد ہیں تو اس انداز کے دوسرے شعرا کے اشعار سنائیے۔
4. انسان کے لیے صرف تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھے رہنا کس حد تک درست ہے اور جمیل مظہری کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟

5. ہر انسان خود کو بہت بڑا سمجھتا ہے، ہمارے لیے ایسا کرنا کس حد تک درست ہے؟

مختصر گفتگو

1. جمیل مظہری کی جائے پیدائش کہاں ہے؟

(الف) دہلی (ب) پٹنہ (ج) مظفر پور (د) کلکتہ

2. جمیل مظہری کا انتقال کہاں ہوا؟

(الف) پٹنہ (ب) کلکتہ (ج) دہلی (د) مظفر پور

3. جمیل مظہری کا پورا نام کیا ہے؟

(الف) میر کاظم علی (ب) مرزا احمد علی (ج) سید احمد علی (د) رضا مظہری

4. جمیل مظہری کی غزلوں کا پہلا مجموعہ کس نام سے شائع ہوا؟

(الف) فکرِ جمیل (ب) ذکرِ جمیل (ج) نقشِ جمیل (د) رقصِ جمیل

5. جمیل مظہری کی وفات کب ہوئی؟

(الف) 1904ء (ب) 1950ء (ج) 1980ء (د) 1985ء

تفصیلی گفتگو

1. جمیل مظہری کے احوالِ زندگی پر روشنی ڈالیے۔
2. جمیل مظہری کی غزل گوئی کی خصوصیات مختصراً لکھیے۔
3. جمیل مظہری کے درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے:

اب تو دھوپ آ پہنچی جھاڑیوں کے اندر بھی اب پناہ لینے کو تیرگی کہاں جائے

4. جمیل مظہری کی پانچ کتابوں کے نام لکھیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد سے پوچھ کر جمیل مظہری کے بارے میں کچھ اور باتیں معلوم کریں۔
2. جمیل مظہری کا کوئی مجموعۂ کلام اپنے اسکول یا علاقے کی لائبریری میں تلاش کر کے اپنی پسند کی کوئی غزل نوٹ کریں۔
3. پتہ چلائیں کہ جنگِ آزادی میں جمیل مظہری نے کس طرح حصہ لیا تھا؟

بسمل عظیم آبادی

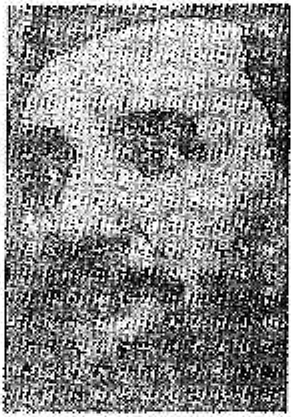

سید شاہ محمد حسن (عرف شاہ جھبو) نام اور بسمل تخلص تھا۔ پٹنہ سیٹی کی مناسبت سے خود کو عظیم آبادی لکھتے ہیں۔ 1900ء میں پٹنہ سے تقریباً تیس کیلو میٹر دور خسرو پور میں پیدا ہوئے۔ دو سال کی عمر میں ہی والد کا انتقال ہو گیا اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نانا سید شاہ مبارک حسین کے سر آ پڑی۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر تعلیم کے لیے بھیجا مگر یہ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ البتہ اس زمانے کے عام دستور کے مطابق عربی اور فارسی کی اچھی خاصی تعلیم حاصل کی اور ابتدائے عمر سے ہی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابتدا میں شاد سے اصلاح لی۔ اس کے بعد مبارک عظیم آبادی کے شاگرد ہوئے۔ 20 جون 1978ء کو طویل بیماری کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا مجموعہ کلام 'حکایتِ ہستی' کے نام سے 1980ء میں شائع ہوا۔

بسمل کا دادیہالی اور نانیہالی رشتہ بہت اعلیٰ نسب بزرگوں سے ملتا ہے۔ ان کے خاندان میں بھی علم و ادب کا چرچا تھا۔ اس لیے بسمل نے دونوں ہی روایتوں سے اثرات قبول کیے اور ایک طرف اپنی غزلوں میں عشقیہ جذبات و واردات کو جگہ دی تو دوسری طرف روحانی عناصر کی طرف بھی متوجہ رہے۔ گویا عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں کا جلوہ ان کی غزلوں میں موجود ہے۔

بسمل کی ایک غزل جنگِ آزادی کے حوالے سے بہت مشہور ہوئی جس کا مطلع ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اس غزل کے بارے میں ایک عرصے تک یہ غلط فہمی رہی کہ یہ رام پرشاد بسمل کی ہے مگر اب شاد کی اصلاح کے ساتھ اس غزل کا عکس خود بسمل کی تحریر میں شائع ہو چکا ہے۔ لطیف جذبات و خیالات کے ساتھ ساتھ اسلوب کی سادگی، روانی اور برجستگی ان کی غزل گوئی کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

بسمل عظیم آبادی

(۱)

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اے شہیدِ ملک، و ملت میں ترے اوپر نثار
لے تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے

آج پھر مقتل میں قاتل کہہ رہا ہے بار بار
آئیں وہ، شوقِ شہادت جن کے جن کے دل میں ہے

وقت آنے دے دکھا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیوں بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ وہ ارماں کی بھیڑ
صرف مٹ جانے کی اک حسرت دلِ بسمل میں ہے

(۲)

تجھے خبر بھی ہوئی یا نہیں ہوئی اے دوست
شبِ فراق جو ہم پہ گذر گئی اے دوست

گلہ نہیں ہے مگر آ گئی ہے بات پہ بات
نگاہ وقت پہ تو نے بھی پھیر لی اے دوست

ہمیں غریب سمجھ کر اٹھا نہ محفل سے
غریب لوگ بھی ہوتے ہیں آدمی اے دوست

قفس نصیبوں کی کرتا ہے اور نیند حرام
سنا سنا کے کہانی بہار کی اے دوست

جلے چراغ سے پہلے چراغ جلتے تھے
اب آدمی سے بھی جلتا ہے آدمی اے دوست

ترے سوا نہ کوئی دوسرا نظر آیا
خدا گواہ جہاں تک نظر گئی اے دوست

کہاں تمام ہوئی داستان بسمل کی
بہت سی بات تو کہنے کو رہ گئی اے دوست

لفظ و معنی

سرفروشی	۔	دلیری، بہادری، جاں بازی
شہید	۔	خدا کی راہ میں قربان ہونے والا، عاشق، فدائی، قربان، مقتول
نثار	۔	صدقے، قربان، واری، فدا
مقتل	۔	قتل کرنے کی جگہ، جہاں قتل کیا جائے
حسرت	۔	کسی چیز کے نہ ملنے کا افسوس، ارمان، شوق، آرزو
شب	۔	رات
فراق	۔	جدائی
گلہ	۔	شکوہ، شکایت
نگاہ	۔	نظر
قفس	۔	جال، پھندا، پنجرا، قید

آپ نے پڑھا

- آپ نے گذشتہ صفحات میں بسمل عظیم آبادی کی دو غزلیں پڑھیں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ دونوں غزلوں کا مزاج الگ ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ بسمل ایک طرف تو روایتی غزل گوئی کے پابند رہے ہیں اور ان کی تربیت ایسے ہی اساتذہ نے کی ہے جو غزل گوئی کی عام روایت سے وابستہ تھے۔ لیکن دوسری طرف بسمل نے اپنے زمانے کے ایک اہم انقلاب یعنی آزادی کی لڑائی سے بھی خود کو جوڑے رکھا تھا۔ اس لیے ان کی غزلوں میں دونوں ہی طرح کے جذبات ملتے ہیں۔
- پہلی غزل کا مزاج ایک انقلابی اور وطن پرست شاعر کے موڈ سے ملتا جلتا ہے۔ شاعر وطن کی آزادی کے لیے لڑنے والوں کو سلام کرتا ہے، شہید ہونے والوں کو احساس دلاتا ہے کہ اپنے تو خیر اپنے ہیں ان کی ہمت کا چرچا غیروں اور دشمنوں کی محفل میں بھی ہے اور انہیں بھی ان شہیدوں کی جان بازی اور بہادری کا اعتراف ہے۔ شاعر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اپنے اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ قتل کرنے والوں کے بازو چاہے جتنے بھی مضبوط کیوں نہ ہوں، وطن کے لیے لڑنے والے وقت آنے پر ان کے دانت کھٹے کردیں گے۔ شاعر خود بھی وطن کی راہ میں مٹ جانے کی حسرت لیے زندہ ہے۔

□ دوسری غزل میں غزل کی عشقیہ روایت سے جڑے ہوئے مضامین ہیں۔ محبوب کی بے وفائی کا شکوہ، اپنی محبت کا اظہار، نارسائی کا احساس اور یہ آرزو بھی کہ اپنی داستان سنانے کے لیے کچھ اور وقت مل جاتا مگر۔

یہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا

آپ بتائیے

1. بسمل عظیم آبادی کی پہلی غزل میں کس قسم کے جذبات کا اظہار ہے؟
2. بسمل عظیم آبادی کی دوسری غزل میں کس طرح کے خیالات پیش کیے گئے ہیں؟
3. 'وطن پر جان دینے والے مرتے نہیں امر ہو جاتے ہیں' آپ اس بات کو مانتے ہیں تو مثالیں دے کر سمجھائیے۔
4. دوسری غزل میں بسمل عظیم آبادی نے 'اے دوست' کہہ کر کس کو مخاطب کیا ہے؟
5. کیا شاعر کا یہ بیان درست ہے کہ 'اب آدمی سے بھی جلتا ہے آدمی اے دوست'۔ اگر ہاں تو کیسے؟

مختصر گفتگو

1. بسمل عظیم آبادی کا پورا نام کیا تھا؟

(الف) سید شاہ احمد حسن (ب) سید شاہ محمد حسن (ج) شاہ جھبو (د) شاہ بسمل

2. بسمل عظیم آبادی کا انتقال کب ہوا؟

(الف) 1975ء (ب) 1978ء (ج) 1980ء (د) 1985ء

3. بسمل عظیم آبادی کے مجموعۂ کلام کا نام کیا تھا؟

(الف) رقص جمیل (ب) حکایات ہستی (ج) رقص شرر (د) نقش جمیل

4. شاعری میں بسمل عظیم آبادی کس کے شاگرد تھے؟

(الف) شاد عظیم آبادی (ب) جمیل مظہری (ج) علامہ اقبال (د) عطا کاکوی

5. سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
بسمل عظیم آبادی کی یہ غزل کس کے نام سے مشہور ہوگئی تھی؟

تفصیلی گفتگو

1. بسمل عظیم آبادی کے حالات زندگی اختصار میں لکھیے۔

2. بسمل عظیم آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات آپ کے خیال میں کیا ہیں؟

3. بسمل عظیم آبادی کے اس شعر کی تشریح کیجیے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے   دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے

4. بسمل عظیم آبادی کی نصاب میں داخل غزلوں میں سے کسی ایک غزل کے پانچ اشعار لکھیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. بسمل عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام اسکول یا علاقے کی لائبریری میں تلاش کریں اور ان کی کوئی اور غزل یاد کریں۔

2. بسمل عظیم آبادی کی پہلی غزل کی صدابندی کریں اور کسی قومی تیوہار کے موقع پر دوستوں کے ساتھ مل کر پیش کریں۔

3. اپنے استاد سے کچھ اور اردو شاعروں کے نام دریافت کیجیے جنھوں نے جنگِ آزادی کے موضوع پر اشعار کہے ہوں۔

گیت

گیت ہندی شاعری کی بہت ہی مشہور صنف ہے۔ اردو میں ہندی مزاج کی نمائندگی کرنے والی یہ صنف بہت پہلے سے رائج ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک کئی شاعروں کے یہاں اس کے نمونے مل جاتے ہیں۔ یہ دراصل دیہات کے عوام کی معصوم دھڑکنوں کی ترجمانی ہے۔ کھیت کھلیان پر جاتے وقت مزدور کسان گنگناتے ہوئے اپنے دلوں کو تازگی بخشنے کے لیے جو نغمہ گاتے ہیں وہی گیت ہے۔ اس لیے گیت میں گانے کی کیفیت ہوتی ہے۔ گیت کی ایک خاص بات اور یہ ہے کہ اس میں ہندی کے نرم و نازک اور سبک رو الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ بناوٹ کے اعتبار سے گیت کی ایک خاص پہچان ہے۔ اس میں پہلے مصرعے کا آخری ٹکڑا ہر چوتھے مصرع میں بار بار دہرایا جاتا ہے۔

بیکل اُتساہی

اصل نام محمد شفیع لودی ہے۔ قلمی نام اور تخلص بیکلؔ اتساہی سے مشہور ہیں۔ ان کے والد کا نام خاں بہادر محمد حنیف خاں تھا۔ بیکلؔ کی پیدائش 1928ء کو موضع گورڈ وال پور گونڈہ میں ہوئی۔ انٹرنس پاس ہونے کے بعد ادیب ماہر اور کامل منشی کی سند بھی لی۔ ہندی میں بھی ڈگری لی۔

انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ لیکن بنیادی طور پر یہ گیت کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ خوش گلوئی ان کا خاص وصف ہے۔ اس لیے مشاعروں میں بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ان کے شعری مجموعوں میں نغمہ وترنم، نشاطِ زندگی، سرور جاوداں، پروائیاں، کومل مکھڑے، بیکلؔ گیت، غزل سانوری، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بیکلؔ اتساہی ابھی بقید حیات ہیں اور ان کا ادبی سفر جاری ہے۔

گیت

گیت ہمارے سب کے لیے ہیں کیا اپنے کیا غیر — کبیرا سب کی مانگے خیر

ایک ہاتھ میں لیے لُکاٹھا، ایک ہاتھ میں پانی
سورگ جلا دے، نرک بجھا دے اس میں کیا حیرانی
ڈر لالچ ہیں ایسے پتلے جن کے ہاتھ نہ پیر — کبیرا سب کی مانگے خیر

دھوپ چاندنی ترے کھلونے رات اور دن دستانے
سورج تیری کرے چاکری دوج کھڑا پچھتانے
رہ جائے تو بھیتر چاہے کر باہر کی سیر — کبیرا سب کی مانگے خیر

مندر، مسجد، گرجا تیرے، تیرے ہیں گردوارے
پھر تیرے گھر میں یہ کیسے قدم قدم بٹوارے
ایک ہی تیرا رستہ جس میں ملیں حرم یا دیر — کبیرا سب کی مانگے خیر

موجوں پر بیٹھی ہے خدائی ساحل پر تنہائی
ناپ رہی تیرے ساگر کی صدیوں سے گہرائی
ڈوبنے والا من کہتا ہے اور ابھی کچھ تیر — کبیرا سب کی مانگے خیر

لفظ و معنی

غیر	۔	اجنبی
خیر	۔	بہتری، اچھائی
سورگ	۔	جنت
نرکھ	۔	نرک، دوزخ
بھیتر	۔	اندر
حرم	۔	کعبہ
دیر	۔	مندر
ساحل	۔	کنارا (دریا کا سمندر کا کنارا)
صدی	۔	سو سال کی مدّت

آپ نے پڑھا

- بیکل اتساہی کا یہ گیت پیت (محبت) کا پیغام دیتا ہے۔ اس گیت میں اپنے غیر سب کی خیر مانگی گئی ہے۔ شاعر نے بتایا ہے کہ مندر مسجد گرجا گرودوارے سب خدا کے ہی گھر ہیں۔ ایسے میں ایک دوسرے کو الگ الگ بانٹنے کا کام غلط ہے۔ سب انسان ایک ہیں۔ بس انسان کی بھلائی میں لگے رہو۔ ہندی کے مشہور شاعر کبیرداس نے اپنے دوہوں کے ذریعہ بھی یہی پیغام دیا ہے کہ 'کبیرا کھڑا بازار میں مانگے سب کی خیر'۔

آپ بتائیے

1. شاعر نے کس کو ایسا پتلا کہا ہے جس کے نہ ہاتھ ہیں نہ پیر؟
2. کبیرا کس کی خیر مانگتا ہے؟
3. حرم کی ضد کیا ہے؟
4. دھوپ کی ضد کیا ہے؟
5. ڈوبنے والا کس کیا کہتا ہے؟

مختصر گفتگو

1. بیکل اتساہی کا اصل نام کیا ہے؟
2. بیکل اتساہی کا سنہ پیدائش کیا ہے؟
3. بیکل اتساہی کی شاعری کس صنف کے لیے زیادہ مشہور ہے؟
4. مصرع مکمل کیجیے۔

گیت ہمارے سب کے لیے ہیں کیا اپنے کیا غیر | کبیرا سب کی مانگے ....

5. جمع بتایئے۔

غیر، خبر، عدد، موت، شریف

تفصیلی گفتگو

1. بیکل اتساہی کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں لکھیے۔
2. کبیرا سب کی مانگے خیر میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
3. گیت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
4. گیت کے پہلے بند کی وضاحت کیجیے۔
5. الفاظ ذیل کی ضد لکھیے۔

ہمارے، غیر، ایک، رات، باہر، حرم، گہرائی، سورج، سورگ

آیئے، کچھ کریں

1. بیکل اتساہی کی شاعری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. بیکل اتساہی کے علاوہ گیت لکھنے والے کچھ اور شاعروں کا نام لکھیے۔

رباعی

چار مصرعوں کی ایک مختصر نظم کو رباعی کہتے ہیں جس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں عام طور پر قافیہ نہیں ہوتا ہے لیکن اگر شاعر چاہے تو تیسرے مصرعہ میں بھی قافیہ کا استعمال کرسکتا ہے۔ پہلے دو مصرعے میں کسی بات کو پیش کرنے کی تمہید باندھی جاتی ہے۔ پھر تیسرے مصرعے میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کوئی ایسا پہلو سامنے لایا جاتا ہے کہ بے ساختہ ذہن اصل موضوع کی طرف راغب ہوجائے۔ اور تب جاکر چوتھے مصرعے میں نہایت ہی پرزور اور اثر انگیز طور پر حاصل مضمون کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے پر ایک ڈرامائی اثر قائم ہوتا ہے۔ یہ مصرعہ اتنا زوردار ہوتا ہے کہ مضمون کا سارا نچوڑ اس میں آجاتا ہے۔ اور ایک خاص بات اس صنف کی یہ ہے کہ اس کا وزن مخصوص ہے۔ عام طور پر **لاحول ولا قوۃ الا باﷲ** • کے وزن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ارکان مخصوص ہیں ان کے بارے میں زیادہ جانکاری اعلیٰ درجات میں دی جائے گی۔

رباعی ایک مشکل فن ہے کیوں کہ کسی بات کو صرف چار مصرعہ میں اس طرح پیش کرنا کہ ایک وحدت تاثر قائم ہو کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے باوجود رباعی ایک مشہور ترین صنف ہے۔ خاص طور پر فارسی شاعری میں اس صنف کو جو عروج حاصل ہوا وہ بے مثال ہے۔ عمر خیام کی فارسی رباعیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ اس کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہوچکا ہے۔ سرمدؔ بھی فارسی کے ایک مشہور رباعی گو شاعر ہیں۔

اردو میں رباعی کی روایت فارسی سے آئی۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے یہاں بھی رباعیاں مل جاتی ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہر زمانے میں شاعروں نے رباعیاں لکھی ہیں۔ ولیؔ، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، مومنؔ آتشؔ، ناسخؔ، غالبؔ جیسے مشہور شاعروں کی رباعیاں بھی مشہور ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی کی مزاحیہ رباعیاں تو بہت مشہور ہیں۔ حالیہ دور میں رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کی رباعیوں کو کافی شہرت ملی ہے۔ یہاں اس کتاب میں تلوک چند محرومؔ، جگت موہن لال رواںؔ اور طلحہ رضوی برقؔ کی رباعیاں شامل کی گئی ہیں۔ آپ اسے پڑھ کر اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ رباعی میں کس طرح کی باتوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ، عاشقانہ، رندانہ غرض کہ ہر طرح کے مضامین پیش کیے جاسکتے ہیں۔ رباعی میں حمد بھی پیش کی جاتی ہے اور نعت بھی کہی جاتی ہے۔

تلوک چند محرومؔ

تلوک چند محرومؔ اردو کے ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔ انھوں نے بے شمار نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔ رباعی کی صنف میں تو انہیں مہارت حاصل تھی۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ 'کلام محرومؔ' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1916ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ 'گنج معنی' کاروان وطن، نیرنگ معانی وغیرہ ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ 'رباعیات محرومؔ' کے نام سے ان کی رباعیوں کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

محروم کی شاعری کا موضوع بنیادی طور پر انسان دوستی ہے۔ وہ ایک صوفی منش انسان تھے اور بلا تفریق مذہب وملت تمام انسانوں سے محبت ان کا بنیادی عقیدہ تھا۔ انھوں نے وطن دوستی اور فطرت پرستی کے تعلق سے بھی بے شمار نظمیں لکھیں ہیں۔ سیاسی موضوعات پر بھی ان کی نظمیں مل جاتی ہیں لیکن جو بھی انھوں نے لکھا ہے ان سب میں کہیں نہ کہیں سے انسان دوستی اور قومی یکجہتی کا پیغام ضرور مل جاتا ہے۔ انسان دوستی اور انسانیت کو پروان پڑھانے کے لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے لیے بچپن سے ہی ایسی تربیت ضروری ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بے شمار نظمیں بچوں کی ذہنی تربیت کے مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی ہیں۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے اس میں ان کے صوفیانہ مزاج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اخلاق و کردار، محبت وخلوص، فنا و بقا جیسے موضوعات ان کی غزلوں میں جگہ پاتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نہایت سادہ عام فہم اور دلکش ہے۔

تلوک چند محرومؔ کا تعلق پنجاب کے مشہور قصبہ گجرانوالہ سے ہے۔ جہاں وہ سن 1887ء میں پیدا ہوئے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ علم کی روشنی لوگوں تک پہنچانا ان کا پیشہ بھی تھا اور ان کا مقصد زندگی بھی۔ سن 1966ء میں ان کا انتقال ہوگیا لیکن ان کی شاعری کو آج بھی لوگوں میں قبولیت عام حاصل ہے۔

رباعیات

(۱)

ہر تن میں نہاں ہے جس نے بخشی ہے جاں
وہ روح رواں ہے جس نے بخشی ہے جاں
انسان کو احترام جاں ہے لازم
خود جان جہاں ہے جس نے بخشی ہے جاں

(۲)

انساں ہے تمیز نیک و بد سے انساں
ورنہ بدتر ہے دام و دد سے انساں
عقل محدود کا تقاضا ہے یہی
گزرے ہرگز نہ رہے حد سے انساں

(۳)

منظور نہ کر اپنے کیے کا الزام
ہے زحمت سر اپنے کیے کا الزام
انسان کو ابلیس سکھاتا ہے یہی
اللہ پہ دھر اپنے کیے کا الزام

(۴)

تہذیب وطن کی ترجماں ہے اردو
سرمایہ فن کی پاسباں ہے اردو
ناثر اس کی لطافتوں پر ہیں نثار
محبوب دل سخن وراں ہے اردو

رُباعی ۔ چار مصرعوں کی نظم جس کا پہلا دوسرا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہو
قافیہ ۔ ایسے الفاظ جن کی آخری آواز ایک ہو۔ جیسے رات، بات، گھر، ڈر وغیرہ
تفریق ۔ فرق کرنا
عام فہم ۔ جسے سب سمجھ سکیں
عروج ۔ بلندی، ترقی
حمد ۔ ایسی نظم جس میں خدا کی تعریف ہو
نعت ۔ ایسی نظم جس میں رسول اکرمؐ کی تعریف ہو
مکمل ۔ پورا
تن ۔ بدن، جسم
نہاں ۔ چھپا ہوا
احترام ۔ عزت
لازم ۔ ضروری
تمیز ۔ فرق
دام ۔ پھندا، جال
زحمت ۔ تکلیف
سرمایہ ۔ دولت، پونجی
نثار ۔ قربان، نچھاور
ناثر ۔ نثار ہونے والا
دَد ۔ درندہ، جانور
محدود ۔ جو حد کے اندر ہو، بہت کم
پاسبان ۔ حفاظت کرنے والا، پہرہ دینے والا

آپ نے پڑھا

- رباعی چار مصرعوں کی ایک چھوٹی نظم ہے جس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔
- عمر خیام فارسی کے مشہور رباعی گو ہیں۔
- قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔
- قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک ہر شاعر نے رباعیاں لکھی ہیں۔
- اکبرالہ آبادی کی مزاحیہ رباعیاں بہت مشہور ہیں۔
- فراق گورکھپوری اپنی رباعیوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔
- تلوک چندم محروم، جگت لال رواںؔ، اور طلحہ رضوی برقؔ کی رباعیاں شامل نصاب ہیں۔
- تلوک چندم محروم پنجاب کے مشہور شہر گجرانوالہ میں 1887ء میں پیدا ہوئے اور 1966ء میں ان کا انتقال ہوا۔
- 'کلام محرم' تلوک چند محرومؔ کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1916ء میں شائع ہوا۔ گنج معنی، کاروان وطن، اور نیرنگ وطن بھی ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔
- 'رباعیات محرومؔ' کے نام سے تلوک چند محروم کی رباعیوں کا انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے۔
- محبت وخلوص، اخلاق و کردار اور انسان دوستی ان کی شاعری کا موضوع ہے۔
- پہلی رباعی میں محرومؔ نے بتایا ہے کہ انسانی جان کا احترام سب سے ضروری ہے۔
- دوسری رباعی میں کہا گیا ہے کہ انسان کو کبھی بھی کسی کام میں اپنی حد سے نہیں گزرنا چاہیے۔
- تیسری رباعی میں شیطانی وسوسے سے بچنے کی تلقین کی گئی اور بتایا گیا ہے اپنے کیے کا الزام اللہ کی مرضی کو نہیں دینا چاہیے۔
- چوتھی رباعی میں اردو زبان کی تعریف بیان کی گئی ہے۔

آپ بتائیے

1. محرومؔ کب پیدا ہوئے؟

(الف) 1885ء (ب) 1886ء (ج) 1888ء (د) 1890ء

2. ان میں سے کون سا شعری مجموعہ محروم کا نہیں ہے؟

(الف) گنج معنی (ب) لفظ و معنی (ج) نیرنگ معنی (د) رباعیات محروم

3. رباعی میں انسان کی تمیز کس سے بتائی گئی ہے؟

(الف) نیک و بد سے	(ب) دام و دد سے	(ج) عقل محدود سے	(د) مال و زر سے

4. اپنے کیے کا الزام اللہ پر دھرنے کو کون سکھاتا ہے؟

(الف) انسان	(ب) ابلیس	(ج) حیوان	(د) درویش

5. انسان کو کس کا احترام لازم ہے؟

(الف) جان کا	(ب) دولت کا	(ج) شہرت کا	(د) عزت کا

مختصر گفتگو

1. محرومؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. محرومؔ کے دو شعری مجموعوں کے نام بتائیے۔
3. عمر خیام کس زبان کے شاعر ہیں؟
4. مزاحیہ رباعیوں کے لیے کون مشہور ہے؟
5. تلوک چند محرومؔ کا پہلا شعری مجموعہ کون سا ہے؟
6. محرومؔ کا سال وفات کیا ہے؟
7. نیک کی ضد کیا ہے؟
8. مقصد کی جمع لکھیے۔
9. لفظ رباعی مذکر ہے یا مؤنث

تفصیلی گفتگو

1. رباعی کسے کہتے ہیں؟
2. محرومؔ کی پہلی رباعی میں کیا بات کہی گئی ہے؟
3. اردو کے تعلق سے تلوک چند محرومؔ نے اپنی رباعی میں کیا کہا ہے؟
4. محرومؔ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

5. معنی کے اعتبار سے لفظوں کو ملایئے۔

ربع	تکلیف
احترام	چار
دام	عزت
زحمت	جال

آیئے، کچھ کریں

1. لائبریری جا کر تلوک چند محروم کی کتابوں کو پڑھیے۔
2. محروم کی وہ رباعی جو نصاب میں نہیں ہے چن کر لکھیے۔

طلحہ رضوی برق

طلحہ رضوی برقؔ کا اصل نام سید شاہ ناصر رضوی ہے۔ ان کے والد سید شاہ محمد قائم رضوی اپنے زمانہ کے مشہور شاعر اور خطیب تھے۔ قتیل دانا پوری ان کا تخلص تھا۔ اس طرح شاعری طلحہ رضوی برقؔ کو ورثہ میں ملی ہے۔ ان کی والدہ محمودہ خاتون بھی شاعرہ تھیں۔ برقؔ اپنے نانیہال پھلواری شریف میں پیدا ہوئے۔ ان کا سال پیدائش سن 1938ء ہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ حنفیہ نعمانیہ دانا پور میں ہوئی پھر بلدیہ ہائی اسکول دانا پور سے انھوں نے 1950ء میں میٹرک پاس کیا۔ پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انھوں نے 1962ء میں پٹنہ یونی ورسٹی میں اردو میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور جین کالج آرہ میں شعبہ اردو سے وابستہ ہو کر درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ ویر کنور سنگھ یونی ورسٹی کے صدر شعبہ کے عہدے تک پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔ شعر و ادب کی خدمت کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔

طلحہ رضوی برقؔ کا تعلق مشہور صوفی خانوادے سے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع اخلاق و تصوف ہے۔ مذہبیات سے ان کا گہرا تعلق ہے اور اس کے اثرات بھی شاعری میں دکھائی دیتے ہیں چنانچہ نعت گوئی کے لیے ان کی شاعری مشہور ہے۔ نعتیہ شاعری کے تعلق سے ان کی ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ ان کے کئی تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی غور و فکر، نقد و نظر، تفحش اور ارزش ادب کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

برق بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ 'شایگاں' اور 'سحاب سخن' کے نام سے ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حیات و کائنات سے تعلق رکھنے والی مختلف باتوں کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی غزلوں میں سادگی روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ قطعہ تاریخ لکھنے میں بھی ان کو مہارت حاصل ہے۔ ان کی رباعیات بھی کافی اہم ہیں۔

رباعیات

(۱)

ضد، جہل، حسد، بغض، عداوت کینہ
دل سینے میں علتوں کا ہے گنجینہ
ہے اس عجب نظر کو تاریکی سے
گم کیوں نہ ہو پھر ترقیوں کا زینہ

(۲)

ہر سمت انسانوں کا ریلا کیسا
افسوس کہ جاتا ہے اکیلا کیسا
کیا آرزوئے متاعِ دنیا اے برقؔ
رہنا ہی نہیں ہے جب جھمیلا کیسا

(۳)

لینے کے نہ دینے پڑیں پھر ایک دو
بے موقع و بے محل زباں مت کھولو
تنقید کا حق رکھتے ہو بے شک لیکن
جب دیکھ لو تصویر کے ہر پہلو کو

(۴)

آواز اگر دیں تو توقف نہ کرو
نقصان بھی کچھ ہو تو تاسف نہ کرو
جھڑکو نہ انھیں بچھادو بازو جھک کر
ماں باپ کی خدمت میں کبھی اُف نہ کرو

لفظ و معنی

برق	۔	بجلی
خطیب	۔	خطبہ دینے والا
ورثہ	۔	جو چیز خاندانی طور پر ملے
درس	۔	نصیحت، تعلیم
تدریس	۔	درس دینا، پڑھانا
کائنات	۔	دنیا
ضد	۔	ہٹ، خلاف، کسی چیز پر اڑ جانا
جہل	۔	جہالت
بغض	۔	بدخواہی، دل میں دشمنی رکھنا
عداوت	۔	دشمنی
کینہ	۔	کسی کے خلاف دل میں بات بٹھا لینا
علت	۔	سبب، وجہ، بکھیڑا، روگ، بری عادت
زینہ	۔	سیڑھی
تاریکی	۔	اندھیرا
آرزو	۔	تمنا
بے محل	۔	بے موقع
تنقید	۔	کھوٹے کھرے کی پہچان کرنا
توقف	۔	دیر، کچھ وقت لگانا
تاسف	۔	پچھتاوا، افسوس
گم	۔	کھویا ہوا
حسد	۔	کسی کی اچھائی دیکھ کر جلنا
انس	۔	لگاؤ، محبت

آپ نے پڑھا

- طلحہ رضوی کا پورا نام سید شاہ ناصر رضوی اور برقؔ تخلص ہے۔
- برقؔ کے والد قتیلؔ داناپوری اور والدہ محمودہ خاتون تھیں۔ دونوں شاعر تھے۔
- برقؔ 1938ء میں پھلواری شریف میں پیدا ہوئے ان کا خاندانی سلسلہ پیروں کا تھا۔
- شایگان اور سحاب سخن برقؔ کے شعری مجموعے ہیں۔
- غور وفکر اور نقد سخن برقؔ کے تنقیدی مجموعے ہیں۔
- برقؔ کی نعتیہ شاعری بہت مشہور ہے انھوں نے قطعات اور رباعیات میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور غزلیں بھی لکھی ہیں۔
- عشق وتصوف اور اخلاق وکردار ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔
- ان کا انداز بیان سادہ سلیس اور اثر انگیز ہے۔
- پہلی رباعی میں انہوں نے بتایا ہے کہ حسد عداوت اور کینہ کی علت ہماری ترقی میں رکاوٹ ہے۔
- دوسری رباعی میں دنیا کے جھمیلوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور کہا گیا کہ اس سے کیوں دل لگایا جائے جبکہ یہاں رہنا ہی نہیں۔
- تیسری رباعی میں کہا گیا ہے کہ تصویر کے ہر پہلو پر غور کیے بغیر کسی کی تنقید کرنا اچھا نہیں۔
- چوتھی رباعی میں ماں باپ کی خدمت پر زور دیا گیا ہے اور یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ ان کو اف تک نہ کہو۔

آپ بتائیے

1. برقؔ کا اصلی نام کیا ہے؟

(الف) سید ناصر رضوی (ب) سید عین رضوی (ج) سید حسنین رضوی (د) سید مرتضٰی رضوی

2. ان میں کون سی تصنیف برقؔ کی ہے؟

(الف) فکر ونظر (ب) نقطۂ نظر (ج) غور وفکر (د) نقد ونظر

3. برقؔ کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) منیر شریف (ب) پھلواری شریف (ج) بہار شریف (د) اجمیر شریف

4. برقؔ کس عہدے سے سبکدوش ہوئے؟

(الف) صدر شعبہ اردو (ب) صدر شعبہ فارسی (ج) صدر شعبہ انگریزی (د) صدر شعبہ تاریخ

مختصر گفتگو

1. ہمیں کس کی خدمت میں اُف نہیں کرنا چاہیے؟
2. برق کے والدین کا نام لکھیے۔
3. ہماری ترقی کا زینہ کیوں گم ہے؟
4. برق کے دو شعری مجموعوں کا نام لکھیے۔
5. برق کس سن میں پیدا ہوئے؟
6. برق کا پہلا شعری مجموعہ کون سا ہے؟
7. تصویر کے ہر پہلو کو پرکھ کر کچھ کہنے کا نام کیا ہے؟
8. جو چیز مرجانے والی ہے اسے ہم کیا کہتے ہیں؟

تفصیلی گفتگو

1. تنقید کیسے کرنی چاہیے؟
2. چوتھی رباعی میں کیا کہا گیا ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔
3. دوسری رباعی میں شاعر نے کیا پیغام دیا ہے؟
4. برق کا تعارف چند جملوں میں کرائیے۔
5. ضد بتائیے۔

تاریکی، توصیف، حسرت، نفرت، زمین

5. جمع بتائیے۔

درس، تعلیم، مذہب، شاعر، علم۔

ABSOL SOLUTIONS PATNA

آیئے، کچھ کریں

1. پھلواری شریف کہاں ہے؟
2. ہندوستان کے مشہور صوفی بزرگوں کے نام معلوم کیجیے۔
3. بہار شریف میں کس صوفی بزرگ کا مزار ہے؟

جگت موہن لال رواں

جگت موہن لال رواںؔ اردو کے ایک مشہور شاعر گذرے ہیں۔ رواںؔ ان کا تخلص تھا۔ انھوں نے بے شمار نظمیں غزلیں اور مثنویاں لکھی ہیں۔ رباعی کی صنف میں ان کو خاصی مہارت حاصل تھی 'رباعیات رواں' کے نام سے ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ایک مثنوی بھی 'نفذرواں' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ 'روح رواں' کے نام سے ایک شعری مجموعہ بھی موجود ہے۔

رواںؔ 1889ء میں اتر پردیش کے ایک شہر اناوہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی بے حد ذہین اور محنتی تھے۔ شاعری کا ذوق بھی ان کو بچپن سے ہی تھا۔ مختلف تعلیمی مراحل سے گذرتے ہوئے انھوں نے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے بعد اناوہ میں ہی وکالت شروع کر دی۔ اس پیشے میں انھیں بڑی شہرت اور کامیابی ملی۔

شاعری میں رواںؔ کا ایک خاص انداز تھا۔ تلوک چند محرومؔ کی طرح ان کی شاعری میں بھی اخلاق و کردار کی باتیں ملتی ہیں۔ اپنی شاعری کے ذریعہ انھوں نے اخوت و محبت، ہمدردی اور انسان دوستی کا پیغام دیا ہے۔ ان کی رباعیوں میں زندگی کے ہر پہلو پر اظہار ملتا ہے۔ اکثر و بیشتر وہ ناصحانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا اسلوب نہایت ہی سلیس اور عام فہم ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ان کی عمر نے ان کے ساتھ وفا نہ کی۔ صرف 45 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا سال وفات 1934ء ہے۔

رباعیات

(۱)

یہ کیا کہ حیات جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہان فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شئے ہے رواں
یہ بھی سمجھو کہ زندگانی کیا ہے

(۲)

افلاس اچھی نہ فکر دولت اچھی
جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس ناممکن ہے
اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

(۳)

دل تو نے دیا ہے ذوق غم خواری دے
جان دی ہے تو نفرت دل آزاری دے
تخلیق کی غایتیں تو پوری ہوجائیں
آنکھیں دی ہیں تو نور بیداری دے

(۴)

ہے گرم ہر اک سمت بازار فنا
ہے دارِ حیات سربسر دار فنا
لیکن کیوں کر جہاں کو فانی سمجھوں
ذرّہ کو بھی جب نہیں ہے قرار فنا

لفظ و معنی

دلکش	۔	دل پسند، دل کھینچ لینے والا
سلیس	۔	آسان
ناصحانہ	۔	نصیحت والا
حیات	۔	زندگی
جاودانی	۔	ہمیشہ رہنے والی
جہاں	۔	دنیا
فانی	۔	مرجانے والی
شے	۔	چیز
افلاس	۔	غربت
اصلاح	۔	سدھار
نفس	۔	سانس
عیش	۔	آرام
ذوق	۔	شوق
غم خواری	۔	ہمدردی، دوسروں کا غم دور کرنا
آزاری	۔	تکلیف پہنچانا
تخلیق	۔	پیدائش، بناوٹ
غایت	۔	مقصد، غرض
نور	۔	روشنی
بیداری	۔	جاگنا
فنا	۔	موت
دار	۔	گھر، جگہ
قرار	۔	سکون

آپ نے پڑھا

- روآں کا اصل نام جگت موہن لال تھا۔
- جگت موہن لال 1889ء میں پیدا ہوئے اور 1934ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔
- رباعیات رواں، روح رواں، جگت موہن لال کے شعری مجموعے ہیں اور نقد رواں ان کی مثنوی کا نام ہے۔
- پیشے سے، روآں ایک مشہور وکیل تھے۔
- ان کی شاعری میں زندگی کے ہر پہلو پر اظہار ملتا ہے اور ان کا انداز دلنشیں اور اسلوب عام فہم ہے۔
- رباعی کی صنف میں ان کو مہارت حاصل ہے۔
- ان کی رباعیوں میں زندگی موت، اخوت، محبت اور انسانی دوستی کے موضوعات ملتے ہیں۔
- پہلی رباعی میں روآں نے یہ بتایا ہے کہ موت تو یقینی ہے اس کی فکر سے اچھا ہے کہ زندگی کو بہتر بنانے کی فکر کی جائے۔
- دوسری رباعی میں ایسی دولت سے غربت کو بہتر بتایا گیا ہے جو انسان کے نفس کو مردہ کردے۔
- تیسری رباعی میں انسانی زندگی کا مقصد دل آزاری سے نفرت اور دوسری کی غمخواری بتایا گیا ہے۔
- چوتھی رباعی میں کہا گیا ہے کہ سب چیز کو فنا ہے لیکن پھر بھی کسی کو اطمینان اور سکون نہیں ہے۔

آپ بتائیے

1. روآں کا اصل نام کیا ہے؟

(الف) جگت لال (ب) موہن لال (ج) جگت موہن لال (د) سوہن لال

2. روآں کا انتقال کب ہوا؟

(الف) 1936ء (ب) 1934ء (ج) 1932ء (د) 1935ء

3. تیسری رباعی میں شاعر کس چیز کی دعا نہیں مانگتا ہے؟

(الف) ذوق غمخواری (ب) نفرت دل آزاری (ج) نور بیداری (د) حسرت دل شادی

4. ہر سمت کس چیز کا بازار گرم ہے؟

(الف) فنا (ب) بقا (ج) حیات (د) ذرہ

مختصر گفتگو

1. رواںؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. رواںؔ کے تین شعری مجموعوں کا نام بتائیے۔
3. مصرعہ کو پورا کیجیے۔

آنکھیں دی ہیں تو .... دے

4. فنا کا مطلب کیا ہے؟
5. بقا کی ضد کیا ہے؟
6. رواںؔ کس سن میں پیدا ہوئے؟
7. رواںؔ کی رباعیات کے مجموعہ کا نام بتائیے۔

تفصیلی گفتگو

1. پہلی رباعی کا مفہوم لکھیے۔
2. کس عیش سے ہر طرح کی مصیبت اچھی ہے؟
3. رواںؔ کے بارے میں چند جملے لکھیے۔
4. ضد بتائیے۔

فنا، حیات، جاودانی، نفرت، نور

5. جمع بتائیے۔

مرحلہ، اسلوب، اختیار، شے، غرض

6. معنی کے اعتبار سے لفظوں کا جوڑا بنائیے۔

عیش	روشنی
غایت	موت
نور	شوق

ذوق	آرام
قرار	مقصد
فنا	سکون

آئیے، کچھ کریں

1. لائبریری جاکر جگت موہن لال رواں کی کتابوں کو پڑھیے۔
2. اناوہ کہاں پر واقع ہے۔ اتر پردیش کے نقشہ میں دیکھیے۔

قطعہ

قطعہ بھی رباعی کی طرح چار مصرعوں کی ایک مختصر نظم ہے جس میں کسی خاص خیال یا مضمون کو تسلسل کے ساتھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ایک وحدت تاثر قائم ہو۔ یعنی پڑھنے والے کے ذہن میں وہ بات پوری طرح بیٹھ جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر رباعی اور قصیدہ میں کیا فرق ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے لیکن قطعہ میں ایسا نہیں ہوتا اس کا صرف دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ رباعی کے تیسرے مصرعے میں قافیہ کا استعمال نہیں ہوتا ہے جبکہ قطعہ کے پہلے اور تیسرے مصرعہ میں قافیہ کا استعمال نہیں ہوتا ہے۔ ویسے بعض شعرا کے یہاں ایسے قطعات بھی مل جاتے ہیں جن کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور بعض قطعات میں بالکل رباعی جیسی صورت دکھائی دیتی ہے۔ رباعی کے لیے چند وزن مخصوص ہیں۔ قصیدہ کے لیے کوئی وزن مخصوص نہیں ہے۔ رباعی میں صرف چار ہی مصرعے ہوتے ہیں۔ قطعہ میں چار سے زاید مصرعے بھی ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک قطعہ گوئی کا تعلق ہے اردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہی اس کی روایت مل جاتی ہے۔ اردو کے تقریباً سبھی بڑے شاعروں کے یہاں قطعات مل جاتے ہیں۔ حالیہ دور میں قطعہ گوئی نے باضابطہ ایک صنف کی حیثیت سے اپنی ایک امتیازی شناخت قائم کر لی ہے۔ اختر انصاری نے اسے صنفی حیثیت سے متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے قطعات کے مجموعے کافی مشہور ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا نام بھی اردو قطعات کی تاریخ میں ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی کے مزاحیہ قطعات بھی خاصے مشہور ہیں۔

اختر انصاری

اختر انصاری اردو کے معروف قطعہ نگار ہیں۔ ان کا پورا نام محمد اختر تھا۔ ان کا تعلق قبیلہ انصار سے ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ ہندستان آیا اور اسی مناسبت سے انھوں نے اپنے نام کے آگے انصاری لگایا اور اپنا قلمی نام اختر انصاری رکھ لیا۔ اختر انصاری کی ولادت یکم اکتوبر 1909ء کو یوپی بدایوں میں ہوئی۔ اختر انصاری کے والد کا نام ڈاکٹر محفوظ اللہ تھا۔

ویسے تو اختر انصاری نے شاعری کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ایک قطعہ نگار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی ایک امتیازی شناخت قائم کی ہے۔ 'نغمۂ روح، ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ خاص قطعات پر مبنی ان کا مجموعہ 'آبگینے' اور 'ٹیڑھی زمین' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ قطعات کا ایک انتخاب 'پرطاؤس' کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

اختر انصاری نے اپنے قطعات میں منظر نگاری اور جذبات نگاری کو پیش کیا ہے وہ مناظر فطرت کی بہت ہی لطیف عکاسی کرتے ہیں۔ قنوطیت اور غم انگیز جذبات کی ترجمانی میں ان کو مہارت حاصل ہے۔

اختر انصاری نے شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقید نگاری کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔

قطعات

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے
کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھوں کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

قدم آہستہ رکھ کہ ممکن ہے
کوئی کونپل زمین سے پھوٹتی ہو
یا کسی پھول کی کلی سرِدست
مرے خواب عدم کو لوٹتی ہو

غمِ ماضی، غمِ حرماں، غمِ دل اور غمِ دنیا
یہی طغیانیٔ غمِ زندگی معلوم ہوتی ہے
مری ہستی پہ غم اس طرح چھایا کہ اب اختر
خوشی کی آرزو دیوانگی معلوم ہوتی ہے

دل کو برباد کیے جاتی ہے
غم بدستور دیے جاتی ہے
مرچکیں ساری امیدیں اختر
آرزو ہے کہ جیے جاتی ہے

خون بھر جام انڈیلتا ہوں میں
ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھے ہو شعر کہتا ہوں میں
اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

لفظ و معنی

وحدت	۔	ایک ہونا، یکتائی
تاثر	۔	اثر قبول کرنا
صنف	۔	قسم (نثر و نظم میں فرق کے لیے اس لفظ کا خاص طور سے استعمال ہوتا ہے، اس کی جمع اصناف ہے۔
امتیازی	۔	ترجیحی، اپنے آپ میں الگ......
شناخت	۔	پہچان
قنوطیت	۔	مایوسی
حرماں	۔	محرومی، ناکامی
طغیانی	۔	دریا میں پانی کا چڑھاؤ، اچھال
ہستی	۔	زندگی
عدم	۔	غیر موجود

آپ نے پڑھا

- قطعہ رباعی کی طرح چار مصرعوں کی ایک مختصر نظم ہے عام طور پر جس کا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔
- اختر انصاری اور احمد ندیم قاسمی کے قطعات مشہور ہیں۔
- اکبر الہ آبادی نے مزاحیہ قطعات لکھے ہیں۔
- اختر انصاری کا نام محمد اختر تھا۔ وہ یوپی کے ایک شہر بدایوں میں 1909 ء میں پیدا ہوئے۔
- اختر کے قطعات منظر نگاری اور جذبات نگاری کے لیے مشہور ہیں۔

- 'آبگینے' اور 'ٹیڑھی زمین' ان کے قطعات کے مجموعے ہیں۔
- پہلے قطعہ میں بتایا گیا ہے کہ آنسوؤں کو ضبط کرنے سے دل میں انگارے سے پھوٹنے لگتے ہیں اس لیے تھوڑا بہت آنسو بہنے دینا چاہیے۔ یہ الگ سی بات ہے کہ غم برداشت کرنا بہت بڑا ہنر ہے۔
- دوسرے قطعہ میں زندگی کا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی تلقین کی گئی ہے تا کہ نہ تو خود نہ کسی دوسرے کو نقصان اٹھانا پڑے۔ دوسروں کی تکلیف کا خیال رکھنا سب سے ضروری ہے۔
- تیسرے قطعہ میں یہ بتایا ہے کہ غم زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور خوشی تو بس دیوانگی کا خواب ہے کبھی مل گئی اچھا لگا نہیں تو بس غم ہی غم ہے جس کے ساتھ زندگی گذرتی رہتی ہے۔
- چوتھا قطعہ آرزو کو زندگی کی سب سے بڑی قوت بتاتا ہے۔ اگر آرزو نہ ہو تو جینا محال ہو جائے۔
- پانچویں قطعہ میں شاعر نے بتایا ہے کہ اس کی شاعری دراصل اسکے غموں کی ترجمان ہے۔

آپ بتائیے

1. اختر انصاری کی ولادت کس سنہ میں ہوئی؟

(الف) 1909ء (ب) 1907ء (ج) 1908ء (د) 1910ء

2. اختر انصاری کا مجموعہ کلام کون سا ہے؟

(الف) نغمہ سنگ (ب) روح نغمہ (ج) نغمہ روح (د) نغمہ دل

3. اختر انصاری کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) دلی (ب) لکھنو (ج) بدایوں (د) عظیم آباد

4. ان میں سے کون سا مجموعہ اختر انصاری کا نہیں ہے؟

(الف) آبگینے (ب) ٹیڑھی زمین (ج) ٹیڑھی لکیر (د) نغمہ روح

مختصر گفتگو

1. اختر انصاری کے تین شعری مجموعوں کا نام لکھیے۔
2. قطعہ نگاری کے لیے مشہور دو شاعروں کا نام لکھیے۔

3. مصرعہ کو مکمل کیجیے

ع .... ہے کہ جیسے جاتی ہے

4. چار مصرعوں کی نظم جس کا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے، اسے کیا کہتے ہیں؟

5. چار مصرعوں کی نظم جس کا پہلا تیسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہو اسے کیا کہتے ہیں؟

6. مزاحیہ قطعات کے لیے کون مشہور ہیں؟

7. بدایوں کس صوبہ کا شہر ہے؟

یلی گفتگو

قطعہ اور رباعی کا فرق بتائیے۔

اختر نے اپنے نام کے آگے انصاری کس مناسبت سے لگایا ہے؟

تیسرے قطعہ میں اختر انصاری نے کیا کہا ہے؟

دیے گئے الفاظ کے سامنے اضداد سے ملائیے۔

وحدت	امید
وجود	کثرت
وشی	عدم
س	غم

چے الفاظ کی جمع دی گئی ہے ان کے واحد بنائیے۔

ات، امتیازات، احوال، الفاظ، مناظر

لفاظ سے ایسے جملے بنائیے کہ مذکر و مؤنث پتہ چلے

، آرزو، پھول، وحدت، قدم

ریں

کے ایک مشہور شاعر کا نام جانیے جنھوں نے بے شمار فلمی نغمے لکھے ہیں۔

میں شامل دو قطعات کو یاد کیجیے۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

وندے ماترم

سُجلام سُفلام ملیج شیتلام،

شسیے-شیاملام ماترم

وندے ماترم!!

شُوبھر-جیوتسنا-پُلکت-یامنیم،

پھُلّ-کُسومت-دُرم دل-شوبھنیم

سُہاسنیم، سومدھر بھاشنیم،

سُکھدام، وردام، ماترم!!

وندے ماترم!!

DARAKHSHAN

(Urdu Textbook for Class-IX)

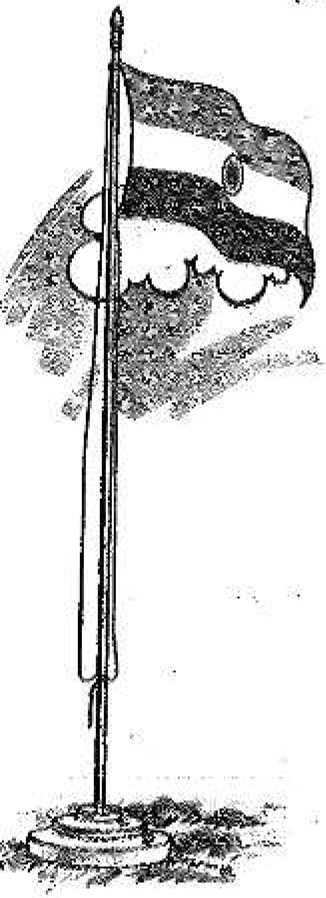

قومی ترانہ

جَن گَن مَن اَدھینا یک جیہ ہے
بھارت بھاگیہ وِدھاتا !
پنجاب سندھ گجرات مراٹھا
دراوڑ اُتکل بنگ !
وِندھیہ ہماچل یمنا گنگا
اُچھل جل دھی ترنگ !
تَو شبھ نامے جاگے،
تَو شبھ آشش مانگے،
گاہے تَو جے گاتھا !
جَن گَن منگل دَایک جیہ ہے
بھارت بھاگیہ وِدھاتا !
جیہ ہے، جیہ ہے، جیہ ہے،
جیہ جیہ جیہ، جیہ ہے !

ABDIEL SOLUTION
ABSOL
PATNA

बिहार स्टेट टेक्स्टबुक पब्लिशिंग कॉरपोरेशन लिमिटेड, बुद्ध मार्ग, पटना–1
BIHAR STATE TEXTBOOK PUBLISHING CORPORATION LTD., BUDH MARG, PATNA-1

मुद्रक : नेशनल प्रिंटिंग वर्क्स, कुन-कुन सिंह लेन, पटना–6